ایک
کوثر نیازی

فروری ۱۹۷۲ء میں پاکستان انٹرنیشنل
ایرلائینز نے پیکنگ کے لیے جو نئی سروس شروع
کی تھی ، اُس کی افتتاحی تقریب میں شرکت
کے لیے ایک وفد چین گیا تھا - خاتونِ اوّل بیگم
نصرت بھٹو اِس وفد کی لیڈر تھیں - مرکزی وزیر
اطلاعات و نشریات ، اوقاف و حج کی حیثیت
سے مَیں بھی اس وفد میں شامل تھا - چین میں
اپنے ایک ہفتہ کے دورانِ قیام جو کچھ مَیں نے
محسوس کیا اسے ایک ڈائری کی شکل میں لکھ لیا تھا -
یہ ڈائری پہلے بھی چھپ چکی ہے - اب اس کا دوسرا
ایڈیشن ہدیۂ قارئین ہے -

اِس ڈائری کی مقبولیت کے پیشِ نظر
مَیں نے اِس میں چند ایک ابواب کا اضافہ بھی
کر دیا ہے - جہاں مَیں نے چین کا مختصر سا جغرافیہ
لکھا ہے وہیں پس منظر پر تھوڑی سی روشنی
بھی ڈالی ہے - اِس کے علاوہ موجودہ چین ،
چینی کیمون ، بارش کا پہلا قطرہ اور چو این لائی
کا دورۂ پاکستان جیسے ابواب کا اضافہ کر کے
اِس ڈائری کو اب ایک مستقل کتاب کی صُورت
میں پیش کر رہا ہوں جسے آپ انشاءاللہ پسند
فرمائیں گے -

کوثر نیازی

ایک ہفتہ

چین میں

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز

لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

طابع : شیخ نیاز احمد
مطبع : علمی پرنٹنگ پریس - لاہور
اشاعت اوّل : اکیس سو
قیمت : پندرہ روپے

مقامِ اشاعت

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز
ادبی مارکیٹ چوک انار کلی - لاہور

ترتیب

ابتدائیہ

"ایک ہفتہ چین میں" کا دوسرا ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ ڈائری یا روزنامچہ کی شکل میں یہ مختصر سی کتاب ان تاثرات پر مبنی ہے جو سفرِ چین کے دوران میرے دل و دماغ پر مرتسم ہوئے۔ میں نے اِن تاثرات کو قلم بند کرنے میں جزبات نگاری سے پرہیز کیا ہے ـــــ وہ باتیں بھی نہیں دہرائیں جو عام طور پر چین کے سفرناموں میں پیش کی جا چکی ہیں۔

یہ ڈائری چین ہی میں لکھی گئی تھی اس لیے کہیں کہیں اس میں میرے ذاتی غم کی جھلکیاں بھی نظر آئیں گی۔ اگر یہ تحریریں باقاعدہ کتاب کے انداز میں لکھی جاتیں تو میں خود ان حصوں کو حذف کر دیتا مگر یہ تو میری ذاتی یادداشتیں تھیں جو چین سے واپسی پر اخبار والوں نے بصد اصرار مجھ سے لے کر شائع کیں۔ ان کی اشاعت پر بعض دوستوں نے مطالبہ کیا کہ انھیں کتابی صورت میں بھی ضرور چھپنا چاہیے، چنانچہ یہ ڈائری کتابی شکل میں چھپ کر منظرِ عام پر آگئی۔ ہاتھوں ہاتھ اس کی پذیرائی ہوئی۔ یقین جانیے مجھے اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کتاب کو اتنا قبولِ عام حاصل ہوگا کہ چند ماہ کے اندر ہی اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو جائے گا۔

طبع دوم کے متعلق میں صرف اتنا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ڈائری کی مقبولیت کے پیش نظر میں نے اس میں چند ایک ابواب کا اضافہ کر دیا ہے۔ کسی قوم کے کردار کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کے جغرافیائی ماحول اور تاریخی حالات سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ اسی اصول کے مدِ نظر میں نے جہاں چین کا مختصر سا جغرافیہ لکھ دیا ہے وہیں تاریخی پس منظر پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالی ہے تاکہ قارئین پر پرانے چین اور نئے چین کا فرق واضح ہو سکے۔

علاوہ ازیں نئے چین میں "کمیون" کے مشاہدے کی تفصیلات کو میں نے قدرے شرح و بسط کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ میرے نزدیک چینی نظام میں اسے بنیادی حیثیت حاصل ہے اور دیگر ممالک کے لیے اس میں سیکھنے کی بہت سی باتیں موجود ہیں۔ اس طرح یہ ڈائری اب ایک مستقل کتاب کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

اضافہ شدہ ابواب کے تحت میں نے اپنی وہ تحریریں بھی شامل کر دی ہیں جو ہفت روزہ "شہاب" کے زمانۂ ادارت میں نکلی تھیں۔ ان میں "بارش کا پہلا قطرہ" اور "مسٹر چو این لائی کا دورۂ پاکستان" تو ۱۹۶۴ء میں لکھی گئی تھیں اور "چینی علماء کی پاکستان میں تشریف آوری" ۱۹۶۶ء میں قلم بند ہوئی تھی۔

۲۹ ستمبر ۱۹۷۴ء کو نیشنل پبلشنگ ہاؤس راولپنڈی میں لیاقت میموریل ہال میں بڑے وسیع پیمانے پر چینی کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ اس نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے میں نے جو مختصر تقریر کی تھی وہ بھی ان اوراق میں محفوظ ہو گئی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ان نگارشات کا سفرِ چین سے کوئی تعلق نہیں مگر کم سے کم ان سے اتنا تو ضرور پتہ چل جائے گا کہ "پاک چین دوستی" کے معاملے میں میری سوچ ہمیشہ صاف اور واضح رہی ہے۔

یکم اگست ۱۹۷۵ء

کوثر نیازی
اسلام آباد

عوامی جمہوریہ چین
ہاربن
موکڈان
پیکنگ
ارمچی
یارقند
سوچو
نانکنگ
نانچنگ
چانگ شا
اموے
کینٹن
کن منگ
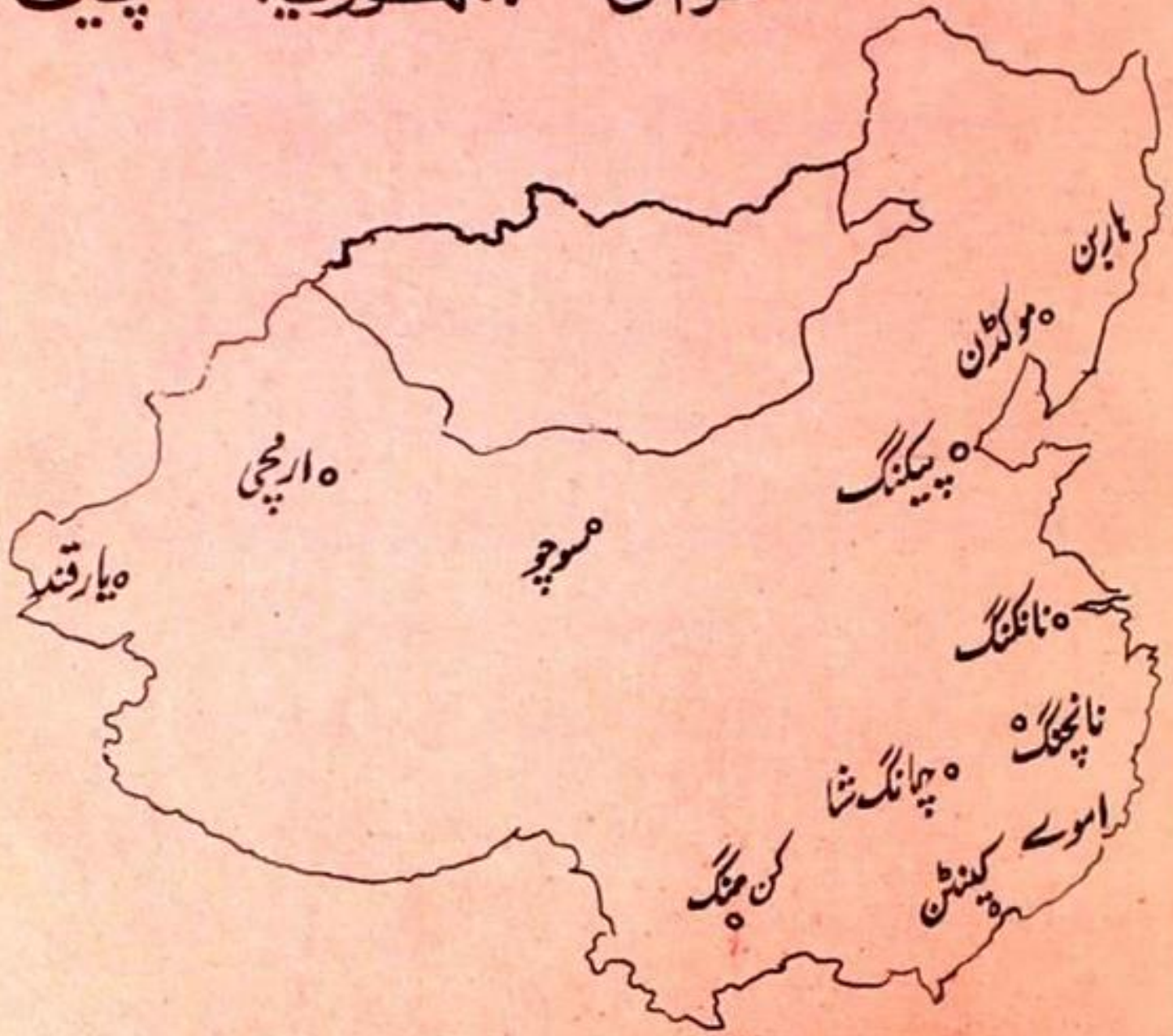
جغرافیائی پس منظر

چین دنیا کے بڑے ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا رقبہ پورے یورپ کے برابر ہے۔ شمال مشرق، شمال مغرب اور مغرب کے ایک حصے میں اس کی سرحدیں روس سے جا ملتی ہیں۔ شمال میں عوامی جمہوریہ منگولیا کا علاقہ ہے۔ جنوب مغرب اور مغرب کے ایک حصے میں افغانستان، پاکستان، ہندوستان، نیپال، سکم اور بھوٹان واقع ہیں۔ جنوب میں برما، لاؤس اور ویت نام اور اس کے مشرق میں کوریا آباد ہے۔ سمندر پار مشرق اور جنوب مشرق کی طرف اس کے بالمقابل جاپان، فلپائن ملیشیا اور انڈونیشیا کے علاقے پھیلے ہوئے ہیں۔

چین کا ساحل چار ہزار میل لمبا ہے۔ یہ ملک تیس صوبوں میں منقسم ہے اور اس میں کئی پُر ہیبت پہاڑ باعظمت دریا اور وسیع میدان ہیں۔

بلند ترین پہاڑ چین کے مغرب اور شمال میں واقع ہیں۔ کوہ "تین شان" شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے اور اس کی بلند ترین چوٹی کی اونچائی ۲۵۰۰۰ فٹ ہے۔ یہ پہاڑ تبت کے کُن لُن سلسلوں کا ایک حصہ ہیں جو آگے چل کر کوہ ہمالیہ سے جا ملے ہیں۔ اسی طرح سنکیانگ اور منگولیا کے ریگستانوں اور روس کے درمیان کوہ الطائی کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔

بنیادی طور پر چین ایک زرعی ملک ہے اور اس کی خوشحالی کا دار و مدار عام طور پر اس کے دریاؤں پر ہے۔ ان دریاؤں میں تین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تبت کے ان پہاڑوں سے نکلتے ہیں جن کی چوٹیاں ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دریاؤں میں کسی موسم میں بھی پانی کی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ان کی وجہ سے پورے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ شمالی چین میں دریائے زرد بہتا ہے۔ دریائے یانگ ٹسی وسطی چین کو سیراب کرتا ہے اور جنوبی چین دریائے سی کیانگ کی گزرگاہ بنا ہوا ہے۔

تینوں دریاؤں میں یانگ ٹسی سب سے بڑا ہے۔ جو چین کے مرکزی حصے میں مغرب سے مشرق کی طرف بہتا ہوا مشرقی بحیرۂ چین سے مل جاتا ہے۔ شنگھائی کی مشہور بندرگاہ اسی دریا کے دہانے پر واقع ہے۔

دریائے زرد جسے ہوآنگ بھی کہا جاتا ہے، لمبائی کے لحاظ سے یانگ ٹسی سے چھوٹا ہے۔ شمالاً جنوباً بہتا ہوا یہ دریا بحیرۂ زرد میں جاگرتا ہے۔

چین کا تیسرا اہم دریا سی کیانگ ہے۔ اس کی لمبائی ایک ہزار میل سے زیادہ ہے۔ یہ ہنان کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور دو بڑی شاخوں کی شکل میں جنوبی بحیرۂ چین میں گر جاتا ہے۔ ہانگ کانگ اور مکاؤ کی مشہور بندرگاہیں اسی دریا پر واقع ہیں چین کے جنوبی حصے میں چاول کی کاشت اور آب پاشی میں اس دریا کو بڑا دخل ہے۔

اس وسیع ملک کے دامن میں بڑے زرخیز خطے موجود ہیں۔ جو اپنے جفاکش اور محنتی عوام کو خوراک اور لباس مہیا کرتے ہیں۔ جنگلات کی وسعت اور معدنیات کے ذخائر کی فراوانی نے ملک کو خوشحال بنانے میں بہت مدد دی ہے۔ سکون سے بہتے ہوئے دریا، اٹھکیلیاں کرتی ہوئی جھیلیں، نقل وحمل اور آبپاشی کے ذرائع مہیا کرتی ہیں۔ "ٹنگ ٹنگ" جھیل خاص طور پر مشہور ہے جو نہروں کے ذریعے دریائے یانگ ٹسی سے ملی ہوئی ہے۔ گرمیوں کے موسم میں جب دریا کا پانی زوروں پر ہوتا ہے تو یہ جھیل چھلک پڑتی ہے، لیکن جاڑے کے موسم میں اس کا پانی دریا کی طرف بہنے لگتا ہے اور دریا اس موسم میں بھی جہازرانی کے قابل رہتا ہے۔

اس جھیل کی لمبائی ۷۵ میل اور چوڑائی ۶۰ میل ہے۔ دوسری بڑی جھیل "پوینگ" ہے اس کی لمبائی ۹۰ میل اور چوڑائی ۲۰ میل ہے۔ اس میں سے بھی ایک بڑی نہر نکالی گئی ہے۔ جو آب پاشی کی ضرورتوں کو پورا کرتی رہتی ہے۔

آب وہوا کے لحاظ سے شمالی چین گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہوتا ہے۔ وسطی چین میں بارش کی تقسیم گرمی اور سردی کے موسم میں ذرا متوازن رہتی ہے۔ جنوبی چین میں بارش بکثرت ہوتی ہے لیکن اس کے بعد حبس پیدا ہوجانے کی وجہ سے شدید گرمی محسوس ہونے لگتی ہے۔

چین ایک نہایت وسیع ملک ہے۔ اسی حساب سے اس کی آبادی بھی بہت گنجان ہے۔ پھر چین کی قیادت خاندانی منصوبہ بندی کی بھی قائل نہیں، الٹا بچوں کی پیدائش پر والدین کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور بچوں کے لیے وظائف مقرر کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے یہاں تقریباً ۸۰ کروڑ انسان آباد ہیں اور سال بہ سال ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

چینی ایک قدیم قوم ہے اور یہ لوگ پرانی روایات کے امین ہیں۔ ان کی تاریخ بھی بہت پرانی ہے لیکن ان کے جو حالات تاریخ میں منضبط ہوسکے ہیں وہ دو ہزار قبل مسیح سے زیادہ پرانے نہیں ہیں۔

تاریخ کے آئینے میں

چین کی آبادی پوری دنیا کے تقریباً چوتھائی حصہ کے برابر ہے۔ اس کے ۹۰ فی صد سے زائد باشندے "ہان" قومیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی دس فیصد قوموں میں منگول، تبتی، میاؤ اور کوریائی وغیرہ چھوٹی چھوٹی اقلیتیں آباد ہیں۔ ثقافتی ترقی کی مختلف سطحوں پر ہونے کے باوجود ان چھوٹی چھوٹی قوموں کی اپنی علیحدہ علیحدہ ایک پرانی اور طویل تاریخ موجود ہے۔

اہلِ چین یوں تو ہزاروں برس تک ایک پراچین تہذیب کے علم بردار رہے ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے لیکن اس کی قلمبند ہونے والی تاریخ تقریباً چار ہزار سال پر پھیلی ہوئی ہے۔

چینی تہذیب کی پوری تاریخ میں اس کی زراعت اور دستکاری کو اپنے اعلیٰ معیار کے سبب ہمیشہ شہرت حاصل رہی ہے۔ آج روزمرہ استعمال میں آنے والی بہت سی چیزوں کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر ہے۔ چین کی قدیم تاریخ میں اس بات کا ذکر موجود ہے کہ آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے چین کے شہنشاہ کی خدمت میں جنوبی ملک کا ایک سفیر حاضر ہوا اور اس نے بادشاہ کی خدمت میں ہاتھی دانت، گرم مسالہ اور چند دیگر قیمتی اشیا تحفے کے طور پر پیش کیں۔ بادشاہ نے بھی اس کو تحفے تحائف دیے اور جب وہ واپس جانے لگا تو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے راستہ بھول جانے کا اندیشہ ظاہر کیا۔ بادشاہ نے کہا کہ انھیں اِس سلسلے میں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس نے ان کو چند رتھ سواری کے لیے دیے،

ہر ایک کے سامنے لوہے کا ایک چھوٹا سا آدمی لگا ہُوا تھا جس کے ہاتھ آگے کی جانب پھیلے ہُوئے تھے۔ بادشاہ نے سفیر سے کہا کہ اس لوہے کے آدمی کا ایک ہاتھ ہر وقت جنوب کی طرف اشارہ کرے گا اور اگر تم اس کے سہارے اپنی سمت قائم رکھو گے تو آسانی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جاؤ گے۔

یہ قصہ بہت پرانے زمانے سے چلا آرہا ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قدیم چینی باشندے مقناطیس سے واقف تھے۔ انھوں نے سمتیں معلوم کرنے کے لیے مقناطیسی سوئی ایجاد کر رکھی تھی چنانچہ اسی سوئی کو آج قطب نما کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو اہلِ چین کی اولین ایجاد ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بہت پہلے چینیوں نے کاغذ بھی ایجاد کر لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ بانس یا کسی دوسری لکڑی کے ٹکڑوں کو کاغذ کی جگہ استعمال کیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ انھیں درختوں کی چھال، پرانے کپڑوں اور ماہی گیری کے پھٹے پرانے جالوں سے کاغذ تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا تو کاغذ سازی نے گھریلو صنعت کی شکل اختیار کر لی۔

اسی طرح چھاپے کی ایجاد بھی چینیوں کی جدّت طرازی کا نتیجہ ہے۔ چھاپے کے ذریعے طباعت کا طریقہ ۱۳۰۰ سال قبل سوئی خاندان کے عہدِ حکومت میں معلوم ہوا اور متحرک ٹائپ کے ذریعہ چھپائی کا آغاز ۹۰۰ برس پہلے پی شنگ نے سونگ خاندان کے دورِ حکومت (۱۰۴۱ تا ۱۰۴۸ء) میں کیا۔

مالی معاملات میں بھی چینیوں نے بنی نوع انسان کی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ کاغذ اور چھاپے کے ایجاد ہو جانے سے بھاری سکوں کی جگہ نوٹ چھاپے جانے لگے اور اس طرح آج سے تیرہ سو سال پہلے مسافروں کی سہولت کے لیے روپے کے لین دین کا وہ طریقہ شروع ہو چکا تھا جو آج کل بینکوں میں

مروّج ہے۔

اس کے علاوہ چینی مٹی سے برتن بنانے، بارود کا استعمال کرنے اور ریشم کے کیڑے پال کر ریشمی پارچات بنانے میں بھی اہلِ چین کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

قدیم زمانے کا چین اپنے دانشوروں اور مدبّروں کی وجہ سے ایک اعلیٰ تہذیب کا حامل رہا ہے۔ اس کا تاریخی دور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے دو ڈھائی ہزار سال پہلے شروع ہوتا ہے۔ جب چین کے حکمران "آسمان کے بیٹے" کہلایا کرتے تھے، یہ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا نمایندہ سمجھتے تھے، اور اس کے نائب بن کر زمین پر حکمرانی کے فرائض بجا لاتے تھے۔

چین کا قدیم ترین بادشاہ جس کے متعلق تاریخی ثبوت ملتا ہے، فوہی تھا جس کا زمانہ تین ہزار قبل مسیح ہے۔ اس نے جانور پالنے اور انھیں سدھانے کے طریقے کو رواج دیا اور اپنی رعایا کو مختلف خاندانوں میں محبت و اتفاق کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے گر بتائے۔ اس نے تصویروں کو تحریر کی شکل دی یعنی ادائے مطلب کے لیے تصاویر کو الفاظ کی جگہ استعمال کیا۔

اسی دور کا دوسرا قابلِ ذکر بادشاہ "شن ننگ" تھا جس نے لوگوں کو ہل چلانے کا طریقہ سکھایا۔ بیج بونا بتایا اور فصل کاٹنے کے لیے مناسب اوزار ایجاد کیے۔

اس کے بعد "ہوانگ ٹی" (زرد بادشاہ) کا دور آیا۔ اس کا زمانہ ۲۷۰۰ سال قبل مسیح کا تھا۔ وہ زرد ریشم کا قیمتی لباس زیب تن کرتا تھا۔ چینی باشندے جو اس وقت تک کسی منظم حکومت کے تحت نہیں تھے، اس نے ان سب کو مرکزی حکومت کے تحت متحد کیا اور تجارت کے اصول ان کو سکھائے۔ اسی کی ملکہ لیزو نے ریشم کا کیڑا دریافت کیا تھا اور اس سے ریشمی دھاگہ حاصل کر کے پارچہ بافی کی صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔

۲۲۵۰ اور ۲۳۵۰ قبل مسیح کے درمیان چین میں دو اہم حکمران گزرے ہیں جن کے نام یاؤ اور شون تھے۔ انھوں نے ملک کو ان اصولوں پر چلایا کہ بادشاہِ وقت اپنے عوام کے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ بڑے بڑے دانشوروں کو انھوں نے اپنے دربار میں ملازم رکھا اور ان کے صلاح و مشورہ سے عوام کی فلاح و بہبود کے کام سرانجام دیئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت چین میں مشہور و معروف خاندان "ہان" برسرِ اقتدار تھا۔ یہ خاندان ۲۰۶ قبل مسیح سے ۲۲۰ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس خاندان سے پہلے وہاں ایک اور بادشاہ گزرا ہے جس نے ۲۲۱ قبل مسیح سے ۲۰۹ قبل مسیح تک حکومت کی وہ اپنے آپ کو "پہلا بادشاہ" کہتا تھا اور اس لقب کو منوانے کے لیے اُس نے اپنے زمانے سے پہلے دور کی تمام تاریخی کتابیں نذرِ آتش کروادی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ چین کی تاریخ اس کے نام سے شروع ہو۔ اسی بادشاہ کے دور کو چین میں "کتاب سوزی" کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

چینی تاریخ میں جنرل ساؤ ساؤ کا زمانہ ۲۲۰ سے ۱۵۵ قبل مسیح شمار ہوتا ہے۔ فوجی عہدیدار ہونے کی وجہ سے اس کا ڈسپلن اور تنظیم اتنی سخت تھی کہ کسی شخص کو اس کی عدول حکمی کی مجال نہیں ہوتی تھی۔ جنرل ساؤ ساؤ چین کا مردِ آہن تھا جس نے چینی افواج کے ذریعے ملک کو شاہراہِ ترقی پر ڈال دیا تھا۔

صدیوں سے چین کے دشمن وہ خانہ بدوش لوگ رہے ہیں جو دیوارِ چین سے باہر خیمہ زن رہا کرتے تھے۔ یہ تاتاری النسل تھے۔ ان میں اور چینیوں میں اکثر لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ حملہ آور تاتاری ان کے دیہاتوں کو لوٹ لیتے تھے۔

۱۱۶۲ء میں منگولیا میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے جوان ہو کر سارے ایشیا کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ چنگیز خان تھا۔ اس نے جلد ہی ایک فوج ترتیب

دے کر اپنے دشمنوں کو نیچا دکھانا شروع کر دیا۔ اور اتنی شہرت حاصل کر لی کہ وہ منگولوں کا سردار بن گیا اور اپنی بہت سی قوت اکٹھی کر کے وہ چین سے برسرپیکار ہُوا اور چینی فوجوں کو بُری طرح شکست دے کر منگولیا واپس آگیا۔ فتح کے نشے سے چور ہو کر اس نے مغربی ممالک پر حملہ کرنے کی ٹھانی اور آخر ۶۵ سال کی عمر میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا پوتا قبلا قاآن سلطنتِ منگولیا کا حکمران بنا اور اس نے چین کو بھی اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔

چین میں ملکہ ڈوویجر کا نام بھی بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس ملکہ نے ۱۹ ویں صدی کے آخر میں ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ الحاق کر کے دنیا کے بہت سے باشندوں پر حکمرانی کی۔ یہ ۱۸۳۵ء سے ۱۹۱۰ء تک کا زمانہ تھا۔ ۱۸۵۰ء میں جب چین کے شہنشاہ ٹاؤ کوانگ کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا لیکن وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ اس کے بعد اس کا پنج سالہ بیٹا تخت نشین ہوا ڈویجر اس کی نگران مقرر ہوئی لیکن ۲۰ سال کی عمر میں وہ مرض چیچک کا شکار ہو کر مر گیا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ملکہ ڈوویجر نے چالاکی سے اپنے ایک بھتیجے کو جو صرف چار سال کا تھا، تخت پر بٹھا دیا۔ اس کا نام کوانگ شو تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے ملکہ ڈوویجر کی نگرانی سے آزاد ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ملکہ کو اس بات کا علم ہوا تو اسے ایک جزیرے میں جلا وطن کر دیا اور خود حکومت کی باگ ڈور سنبھال کر اپنے تمام مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور مرتے دم تک نہایت ہوشیاری کے ساتھ حکمرانی کرتی رہی۔

چین میں شہنشاہیت کا یہ دور ختم کرنے کا سہرا چین کے مشہور لیڈر سن یات سین کے سر ہے۔ جن کو اکثر "جمہوریہ چین کا باپ" کہا جاتا ہے۔ وہ ۱۸۶۷ء میں کینٹن کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ انھوں نے مادرِ وطن کو منچو حکمرانوں کے پنجے سے آزاد کرانے کی کوشش میں صرف کیا کیونکہ

یہ حکومت ملک میں کسی قسم کی اصلاح اور ترقی کی حامی نہیں تھی۔

ڈاکٹر سن یاٹ سین کے چین میں انقلاب برپا کرنے اور منچو خاندان کو معزول کرنے کی یہ داستان بہت طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ شمعِ آزادی کے اس پروانے نے اپنی جان پر کھیل کر دشمنوں کو عبرت ناک شکست دی اور یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو ڈاکٹر سین متفقہ طور پر جمہوریہ چین کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۲۵ء کو پیکنگ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن آزادی کی وہ شمع جو انھوں نے چینیوں کے دل میں روشن کر دی تھی وہ برابر جلتی رہی۔

چین واقعی ایک عظیم اور وسیع ملک ہے۔ جسے اپنی کثیر آبادی، طویل تاریخ، انقلابی روایات اور تابناک تاریخی میراث پر بجا ناز ہے۔ شروع ہی سے چین انقلابات کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ یہاں بادشاہتیں بنتی اور بگڑتی چلی آئی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ چین نے غلام معاشرے سے جاگیر دارانہ معاشرے میں قدم رکھا، لیکن اس کے بعد سے اس کی اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی ترقی کی رفتار عرصہ دراز کے لیے سست ہو کر رہ گئی۔

جاگیر دارانہ معاشرہ جس کا آغاز چو اور چھن خاندانوں سے ہوا تھا، تقریباً تین ہزار برس تک قائم رہا۔ ۱۸۴۰ کی جنگِ افیون کے بعد چین نے بتدریج نیم نو آبادیاتی اور نیم جاگیر دارانہ معاشرے کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور اسے نو آبادیاتی ملک بنانے میں سامراج کو بہت بڑا دخل حاصل رہا ہے۔

۱۹۱۱ء کے انقلاب نے چنگ خاندان کا جو چین پر کوئی سو سال سے حکمرانی کرتا چلا آرہا تھا، تختہ الٹ دیا۔ ۱۹۲۴ء کی انقلابی جنگ کے دوران جنوب میں کمیونسٹ اور کومنتانگ اتحاد کی انقلابی قوتیں اور طاقت پکڑ گئیں اور انھوں نے شمالی مہم میں فتح حاصل کی جب کہ شمال کے جنگ آزماؤں کو جو پہلے سے حکمران

تھے شکستِ فاش کا منہ دیکھنا پڑا۔ ۱۹۳۱ء تک چین اسی حالت سے دوچار رہا لیکن چین کے دلیر عوام نے اپنی آزادی کی جدوجہد بڑے ذوق و شوق سے جاری رکھی اور بالآخر وہ اس میں کامیاب ہو کر رہے۔

موجودہ چین

چین کو آج دنیا کی عظیم ترین جمہوریہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ عوامی جمہوریہ ایشیا کے مشرق کی طرف بحرِ کاہل کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۳۷ لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے اور اس میں ۸۰ کروڑ سے زیادہ انسان بستے ہیں۔ ان میں سے محض ۱۲ فی صد شہری ہیں اور باقی دیہاتوں میں آباد ہیں۔

عوامی جمہوریہ چین ۱۹۴۹ء میں معرضِ وجود آئی تھی۔ چین کے عظیم رہنما ماؤزے تنگ نے اپنے خیالات و افکار سے چینی قوم پر گہرا اثر ڈالا ہے اور ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ماؤ کے افکار نے دیہی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم کو اس قدر عام کر دیا ہے کہ ہر شخص کے دل میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے۔ مزدور اور کسان سب منظم ہو چکے ہیں اور ملک بھر میں "اپنی مدد آپ" کے زریں اصول پر عمل کر کے خوشحالی اور فارغ البالی کی لہر دوڑ چکی ہے۔

انتظامی لحاظ سے اس وقت چین مرکزی حکومت کے تحت تین میونسپل کمیٹیوں میں منقسم ہے۔ اس کے ۲۲ صوبے ہیں اور پانچ خود مختار حصے ہیں جو پیکنگ، شنگھائی اور ٹائن سٹن میونسپل کمیٹیوں کے نام سے مشہور ہیں۔

پیکنگ جو قومی دارالحکومت ہے، شمالی چین کے میدانی علاقہ میں شمال کی طرف واقع ہے۔ چین کی پرانی تاریخ میں بھی پیکنگ کو دارالخلافہ بننے کی خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ۱۶۴۴ء میں منچو شہنشاہ نے اسے اپنا پایۂ تخت بنایا اور

۱۶۴۴ء تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہی - اس دوران مختلف خاندان یہاں یکے بعد دیگرے حکمران ہوتے رہے - ۱۹۱۲ء میں جب انقلاب کے نتیجے میں چین کے اندر جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا تو پیکنگ کے بدلے نانکنگ صدر مقام بنا لیا گیا۔

پیکنگ کا موجودہ شہر بہت کچھ شاہ ینگ لو کی کوششوں کا مرہونِ منت ہے جس نے چین پر ۱۴۰۳ سے ۱۴۲۵ء تک حکومت کی۔ اس نے اس شہر کی تعمیر بہت کچھ اس ڈھنگ پر کی جو مشہور فاتح قبلا قاآن نے اختیار کیا تھا۔ پیکنگ کے شمال مغرب میں چالیس میل کے فاصلے پر وہ مشہور دیوار بنی ہوتی ہے جسے دیوارِ چین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یوں تو اہلِ چین افیون کھانے اور سُست پڑے رہنے کی وجہ سے بدنام چلے آئے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جب بھی کوئی عملی قدم اٹھایا ہے تو دنیا نے ان کی کوششوں کی تعریف کی ہے - ان کی بنائی ہوئی یہ دیوار دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دیوار نے مدتوں اہلِ چین کی حفاظت کی ہے۔

قدیم چینی قانون کی رُو سے کسی بڑے گھر میں پیدا ہونا عالی مرتبہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اگر کسی غریب شخص کا بیٹا تعلیم حاصل کر کے نامور ہونے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین کی غربت آڑے نہیں آتی - اس کا علم و فضل اُسے معاشرے میں سب سے اونچا درجہ دیتا ہے اور ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جاتا ہے - کسان اور محنت کش کو معاشرے میں عزت کا مقام حاصل ہے اُسے قوم کا سب سے بڑا خادم خیال کیا جاتا ہے کیوں کہ وہ سب کے لیے محنت کرتا ہے۔ غلّہ اُگاتا ہے اور اسی کی ترقی اور خوشحالی ملک و قوم کا مطمعِ نظر ہے۔

پائندہ باش ذارعِ بدبخت، رنج بر   اے آنکہ زندگانی مادر بقائے تُست

اپنے عظیم رہنما کی زیرِ قیادت چینی عوام آج ایشیا کی ایک عظیم قوم ہیں۔
یہ لوگ محنت مشقت سے جی نہیں چُراتے ۔ دن بھر کی محنت کے بعد جو کچھ میسّر
آتا ہے ، اسی پر قناعت کرتے ہیں اور ملک و قوم کی طرف سے جو ذمہ داریاں ان
پر عاید ہوتی ہیں انھیں پُورا کرنے میں لگے رہتے ہیں ، کیوں کہ یہی انھیں سکھایا
گیا ہے اور اسی میں ان کی سربلندی و خوش حالی کا راز مضمر ہے ۔

ماؤزے تنگ اور چین

ایک زمانہ تھا کہ چین کی دیہی آبادی خود غرض اور ظالم زمینداروں کے پنجۂ ستم میں جکڑی چلی آتی تھی اور وہ کبھی اپنی گرفت کو ڈھیلا کرنے پر راضی نہیں ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مزارعین کو کبھی زندگی کے حقیقی حسن سے آشنا نہیں ہونے دیا اور ان کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی کہ اپنی گرفت کو اور زیادہ مضبوط کرتے رہیں، آلاتِ کشاورزی کو جدید طرز میں ڈھالنے کے لیے وہ محض اس وجہ سے تیار نہیں ہوتے تھے کہ اس طرح کسان خوشحال ہو جائیں گے اور ان کی جاگیرداریوں کو ایک نیا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اسی لیے وہ کسان طبقہ میں تعلیم کے بھی خلاف رہے اور دیہاتوں میں مکتب یا مدرسے کا وجود تک بھی گوارہ نہ کیا لیکن ماؤ کی انقلابی حکومت نے عام آدمی کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔ آج جو زرعی ترقی چین کو نصیب ہوئی ہے، وہ چین کے عظیم لیڈر ماؤ کی تعلیمات ہی کا نتیجہ ہے۔ آج کے چین میں جگہ جگہ سکول قائم ہو چکے ہیں، جہاں طالب علموں کو دیہی اور زرعی ترقی میں حصّہ لینے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ ان اسکولوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں وہی تعلیم دی جاتی ہے جو عوام کو عملی زندگی میں کام دے سکے۔ اس تعلیم کی تہہ میں جو مقصد کار فرما ہے، وہ ایک اور صرف ایک ہے —— اور وہ ہے کھیت کی پیداوار بڑھانا! اِسی لیے ان اسکولوں میں جن امور پر توجہ دی جاتی ہے وہ یہ ہیں :۔

۱۔ نئے ذرائع آب پاشی اختیار کر کے زمین کو قابلِ کاشت بنانا۔

۲۔ جدید زرعی آلات سے کام لینا

۳۔ قدرتی کھاد فراہم کرنے کے ذرائع دریافت کرنا۔

۴۔ زمین کو زیادہ سے زیادہ زرخیز بنانا۔

۵۔ زیادہ سے زیادہ رقبہ کو قابل کاشت بنانا۔

۶۔ فصلوں کی بیماریوں کو دور کرنا۔

۷۔ کیڑے مکوڑوں کا مارنا۔

۸۔ بنجر رقبے کو آباد کرنا۔

یہ مقاصد چینی زبان کے آٹھ الفاظ میں ہر چینی کے ذہن نشین رہتے ہیں اور وہ ان پر عمل پیرا ہونے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔

ماؤزے تنگ کی انقلابی تعلیمات کے زیر اثر چینیوں کو ایک نہایت زریں اصول ہاتھ آگیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسی اصول کو اپنا کر اہلِ چین نے اقوامِ عالم میں اپنے لیے ایک باعزت جگہ تلاش کر لی ہے۔ وہ اصول ہے —— اپنی مدد آپ —— چنانچہ وہ اسی اصول پر عمل کر کے عزم اور ہمت کے ساتھ اس شان سے اپنے کھیتوں کی پیداوار بڑھا رہے ہیں کہ چین جہاں دنیا بھر کی آبادی کا پانچواں حصہ آباد ہے اور جو انقلابی حکومت سے پہلے مفلوک الحالی اور جہالت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا —— آج خوشحالی سے پوری طرح ہم کنار ہے۔ یہ سب کچھ تعلیم محنت، اور اتحاد کی برکتوں سے ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ جو قوم بھی ان سنہری اصولوں کو اپنائے گی کامیابی اس کے قدم چومے گی۔

آج کا چین ماؤزے تنگ کی قیادت میں شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے۔ کل وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، آج اس کے محنتی ہاتھوں میں آزادی کے گلدستے بہار دے رہے ہیں۔

آج کا چین ایک ناقابلِ تسخیر طاقت بن کر ابھرا ہے۔ ماؤزے تنگ نے جو

کچھ کہا تھا، یہ اس پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے۔

ماؤ نے کہا تھا:

"ہماری معاشی تعمیر کی مرکزی کڑی زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ کرنا، اپنی بیرونی تجارت کو فروغ دینا اور امدادِ باہمی کی انجمنوں کو مضبوط بنانا ہے۔"

"میں نے چالیس برس تک خود کو قومی انقلاب کے مقصد کے لیے وقف کیے رکھا تاکہ چین کے لیے آزادی اور برابری کا درجہ حاصل کیا جا سکے۔ ان چالیس برسوں کے درمیان میرے تجربات نے مجھے پوری طرح اس بات کا قائل کر دیا ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ ضروری ہے، ہم عوام الناس کو بیدار کریں اور ایک مشترکہ جدو جہد میں دنیا کی ان اقوام کے ساتھ اتحاد قائم کریں جو ہم سے برابری کا سلوک کرتی ہیں۔"

"دیکھیے! نیا چین نظروں کے سامنے ہے۔
ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔
نئے چین کا مستول افق پر نمودار ہو چکا ہے۔
ہمیں تالیاں بجاتے ہوئے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔
اپنے دونوں ہاتھ بلند کیجیے۔
نیا چین ہمارا ہے!"

چینی کمیون

یہ ۶ راگست ۱۹۵۸ء کا دن تھا کہ ہلکے سے نیلے رنگ کی ایک گاڑی صوبہ ہونان کے چلی ینگ پیپلز کمیون کی دفتری عمارت کے نیچے آکر رکی۔ گاڑی سے ایک صحت مند انسان نیچے اُترا۔ اس کے چہرے پر بشاشت کا تبسم کھیل رہا تھا۔

"دیکھیے، یہ چیئرمین ماؤ ہیں!"

تماشائی فرطِ مسرت سے چلّا اُٹھے۔ انھوں نے فلک شگاف نعرے بلند کیے۔

"چیئرمین ماؤ زندہ باد!"

لوگوں کا ہجوم دست بوسی کے لیے بے تاب نظر آتا تھا اور جس کو بھی ان سے ہاتھ ملانے کا موقع مل جاتا، وہ مزاج پُرسی کے طور پر ان سے ضرور دریافت کرتا:

"جناب کے مزاج کیسے ہیں؟"

مصافحہ وغیرہ سے فارغ ہو کر چیئرمین کمیون کے دفتر کی طرف بڑھے۔ دروازے کے دائیں جانب ایک سائن بورڈ نظر پڑا، اُسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ سائن بورڈ پر چینی زبان میں لکھا ہوا تھا ——

"چلی ینگ پیپلز کمیون۔ سن شیانگ کاؤنٹی!"

چیئرمین ماؤ نے یہ الفاظ پڑھے اور کہا:

"پیپلز کمیون! بہت اچھا نام ہے!"

اسی روز چیئرمین ماؤ چلی ینگ سے اپنے دیہی دورے پر روانہ ہو گئے۔ ۹ راگستا

کو وہ شان تنگ پہنچے۔ چائنہ کمیونسٹ پارٹی کی صوبائی کمیٹی کے اراکین نے جب
نہیں بتایا کہ وہاں کے بعض علاقے بڑے بڑے اجتماعی فارم ترتیب دے رہے ہیں
تو چیرمین ماؤ نے کہا:

"اجتماعی فارموں کی جگہ پیپلز کمیون بنائے جائیں تو بہتر ہے۔ اس سے
یہ فائدہ ہوگا کہ صنعت، زراعت، تجارت، تعلیم اور فوجی امور سب
ایک ہی ذیل میں آجائیں گے اور اس طرح قیادت کے فرائض کی
انجام دہی میں بھی آسانی پیدا ہو جائے گی۔"

چنانچہ ۲۹ اگست ۱۹۵۸ء کو پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے پولیٹیکل بیورو کے اہم
اجلاس میں چین کے دیہی علاقوں میں پیپلز کمیون قائم کرنے کی قرارداد منظور ہوگئی۔
اس کے بعد چیئرمین ماؤ کی ہدایات اور قرارداد کی رو سے چین میں پیپلز کمیون کے قیام
پر عمل درآمد شروع ہوگیا اور صرف دو ماہ کے اندر اندر چین کا تمام تر دیہی علاقہ
عملی طور پر کمیون نظام کے تحت آگیا۔

اور —— چائنہ کمیونسٹ پارٹی کی آٹھویں مرکزی کمیٹی کے چھٹے اجلاس میں جو
چیئرمین ماؤ کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، ۱۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو یہ اعلان عام ہوگیا
کہ ——

"ایک نئی سماجی تنظیم وجود میں آچکی ہے جو صبح کے سورج کی طرح تر و تازہ
مشرقی ایشیا کے وسیع افق پر نمودار ہے۔"

"کمیون" لغوی اعتبار سے فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جو لاطینی سے ماخوذ
ہے اور اصلاً عوام اور معاشرہ کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ۱۸۷۱ء میں ایک
فرانسیسی بورژوا تحریک سے وابستہ ہو کر اس کے معانی بدل گئے۔ اُن بورژوا
گروہوں نے اپنے علاقوں کو دوسروں سے ممیز کرنے کے لیے خصوصی قوانین نافذ

کر رکھے تھے اور ان علاقوں کو انھوں نے کمیون کا نام دیا تھا۔ یہ دور فرانس کی تاریخ میں دورِ استبداد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مخصوص پس منظر سے جدا کرنے کے لیے چین نے اپنے نظام کو بھی کمیون ہی کا نام دیا ہے لیکن یاد رہے کہ یہ نظام بورژوائی تحریک کی بالکل ضد واقع ہوا ہے۔

۱۹۴۹ء میں عوامی جمہوریہ بن جانے کے فوراً بعد زرعی اصطلاحات لانے کی انقلابی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ غریب کسانوں کو جاگیرداری کے پنجۂ ستم سے رہائی دلائی جاتی۔ چنانچہ چیئرمین ماؤ اور پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے کسانوں میں بیداری کی لہر دوڑا دی کہ وہ اپنے آپ کو اجتماعی پیداوار کے لیے منظم کریں۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۶ء میں چین کا سارا دیہی علاقہ اجتماعی زراعت کی تنظیم کے تحت آ گیا اور پیداواری قوتوں کو مزید کھل کھیلنے کا موقع ملا۔

۱۹۵۷ء - ۱۹۵۸ء میں چینی حکومت نے زرعی زمینوں کا جامع منصوبہ پیش کیا جس میں نہروں اور بندوں کی تعمیر بھی شامل تھی تاکہ آب پاشی کے ان جدید وسائل سے کام لے کر زیادہ سے زیادہ رقبۂ زمین کو زیرِ کاشت لایا جا سکے۔ یہ منصوبے عمل درآمد کے لیے علاقائی کواپریٹو فارموں کے سپرد کیے گئے۔ حکومت نے خود بھی منصوبہ بندی میں ان کی مدد کی۔ مالی قرضے دیے گئے اور ہر ممکن طریق سے ان تنظیموں کی حوصلہ افزائی ہوئی تاکہ وہ خود کفیل اکائی کی حیثیت سے اُبھریں۔

چین کی اسّی فیصد آبادی دیہاتوں میں آباد ہے اور اس کا پیشہ زراعت ہے۔ کسان اور کاشتکار ہی وہاں کی معیشت کی بنیاد ہیں اور انھی کی تعلیم و تربیت سے چین میں انقلاب لانے کی توقع ہو سکتی تھی۔ جاگیرداری عہد میں چینی کاشتکار کی حالت جانوروں سے بدتر تھی۔ وہ زمین سے فصل اگانے کا سارا کام خود انجام دیا کرتا تھا اور جب فصل کی کٹائی کا وقت آتا تو زمیندار اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی اٹھا کر

لے جانا۔ کسانوں کو عسرت و نکبت کی اس دنیا سے باہر نکالنے کے لیے اور معاشرے میں اسے باعزت مقام دینے کے لیے یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ اسے زمین کا مالک بنا دیا جائے لیکن عظیم چینی لیڈر ماؤ اس نظریئے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کسان کی حالت اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود کفیل اور دوسروں پر انحصار کرنے سے بے نیاز نہ ہو جائے۔ ۱۹۴۳ء میں ماؤ نے اس خیال کا اظہار کیا تھا، چنانچہ تعاونِ باہمی کے گروپوں سے اس کی ابتداء ہوئی۔ مختلف اجناس کی کاشت میں کسان ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے۔ اپنی مدد آپ کے جذبے نے ان کے خوابیدہ عزم و ہمت کو جگا دیا تھا اور اب وہ خوشحالی و ترقی کے راستے پر گامزن ہو گئے تھے۔ یہیں سے کواپریٹو فارم کا طریقہ وجود میں آیا اور اسے اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ۱۹۵۸ء تک چین کے ۷۵ فیصد کاشتکار کسی نہ کسی کواپریٹو فارم سے وابستہ ہو چکے تھے۔

چین کے زرعی نظام میں خاص بات اس کا فلسفۂ اجتماعیت ہے، کسان اکٹھے مل کر محنت کرتے ہیں جس سے یقینی طور پر مشقت کا بوجھ بٹ جاتا ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اجتماعی طور پر محنت کرنے سے مشترکہ مقاصد کے لیے کوشش کرنے کا جذبہ روز بروز تقویت پکڑتا رہتا ہے اور اجتماعیت ایک قابلِ قبول فلسفہ بن کر زندگی کی روش کا روپ دھار لیتی ہے۔

۱۹۵۸ء میں جب کمیون نظام قائم ہوا تھا تو امریکی وزیرِ خارجہ جان فاسٹر ڈلس نے کولمبو میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ——

"یہ ایک بے رحم نظام ہے جس نے چینیوں کو عظمتِ انسانی سے محروم کر کے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔"

برطانوی اخبارات نے اس پر مزید حاشیہ آرائی کرتے ہو لکھا تھا کہ:

"یہ نظام کھوپڑیوں کا پہاڑ اور جبر و اکراہ کا بحرِ بے کراں ہے۔"

لیکن جب غیر ملکیوں نے چین جا کر خود اس نظام کو دیکھا تو وہ نہ صرف اس کی افادیت کے قائل ہوئے بلکہ انھوں نے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ ہمیں تو کسی کمیون میں جبر و اکراہ اور بیگار کا انداز نہیں ملتا۔

یہ حقیقت ہے کہ کمیون چینی سوشلزم کا ایک منفرد اور کامیاب تجربہ ہے زرعی پیداوار کو منظم کرنے اور دیہی آبادی کی سیاسی اور اقتصادی قوت کو مشترکہ مقاصد کے لیے کام میں لانے کی یہ ایک نہایت کامیاب صورت ہے۔ تیسری دنیا کے وہ سارے ممالک جن کی معیشت کا دار و مدار صرف زراعت پر ہے اور جو سال ہا سال سے نیم نو آبادیاتی اور نیم جاگیر دارانہ نظام کی زنجیروں میں جکڑے چلے آتے ہیں۔ اُن کے لیے زرعی ذرائع پیداوار کا یہ اجتماعی نظام امید اور روشنی کا مینار ہے۔ اجتماعی خوشحالی کی راہ اختیار کرنے کے لیے چین نے ہر اس قوم اور ملک کو جو انصاف اور مساوات پر مبنی ایک جدید زرعی نظام کی متمنی ہے، انفرادی آبرو اور اجتماعی عزتِ نفس کا رستہ دکھا دیا ہے۔

کمیون کے قوانین کی دفعہ نمبر ۴۲ کے تحت لکھا ہے:

"کمیون کے عوام کے لیے اور ان کی پیداوار، محنت اور معیشت کے لیے دائمی انقلابی جمہوری زندگی کی ضمانت دی جاتی ہے۔"

اس طرح کمیون دیہی علاقے کی ایک ایسی جغرافیائی اکائی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جہاں زرعی پیداوار کے انتظام کو سیاسی قوتِ حاکمہ کے ساتھ وابستگی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی علاقوں کے زرعی پیداواری وسائل انفرادی ملکیت سے نکال کر اُن علاقوں کے باشندوں کے ہاتھوں میں آ چکے ہیں، عوام کے منتخب کیے ہوئے لوگ جہاں اپنی زرعی معیشت کی منصوبہ بندی کرتے ہیں،

پیداواری عمل کا انتظام کرتے ہیں، پیداوار کی تقسیم کے نگران ہوتے ہیں، وہاں بیک وقت وہ مرکزی یا صوبائی حکومت کے تفویض کردہ سیاسی نظم و نسق کے اختیارات بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے اپنے علاقے کی تعلیم و صحت کی ضروریات، سڑکوں اور مکانوں کی تعمیرات، بجلی اور پانی کی فراہمی، صفائی کی دیکھ بھال۔ غرضیکہ ہر کام کے وہ خود ہی منتظم ہیں۔ یہاں تک کہ معاون پولیس (ملیشیا) بھی انہی کے زیرِ انتظام رہتی ہے۔

کمیون کا تنظیمی ڈھانچہ عام طور پر پروڈکشن بریگیڈ اور پروڈکشن ٹیم پر مشتمل ہوتا ہے۔ بریگیڈ کی کمان میں پیداواری ٹیمیں اپنے اپنے فرائض بجا لاتی ہیں اور اس طرح انفرادی پیداواری عمل کی جگہ اب اجتماعی عمل نے لے رکھی ہے۔ کمیون رواج پانے سے پہلے کسانوں کو عام طور پر انفرادی قوت، ہل چلانے والے جانوروں اور سرمائے کی کمی کا سخت سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن اجتماعی طریقِ پیداوار کو اپنانے سے اب ان مشکلات کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اس کے نتیجے میں پیداواری صلاحیت کے بڑھ جانے سے پیداوار میں بھی خاصا اضافہ ہوا ہے۔

نظامِ آب پاشی بہتر ہو چکا ہے، مشینی کاشت فروغ پانے لگی ہے۔ زمین کا استعمال بہتر بنا لیا گیا ہے اور چیئرمین ماؤ کے حکم کے مطابق زراعت کے آٹھ بنیادی سائنٹفک اصولوں پر سختی سے عمل کیا جا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چین کی یہ اجتماعی ترقی اس کی ہمہ جہتی عوامی جدوجہد کی مرہونِ منت ہے۔ یہ ایک ایسا عملی و تعلیمی پروگرام ہے جس میں نچلی سطح پر عوام باہمی اشتراکِ عمل سے مقامی وسائل کو بروئے کار لا کر اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ "اپنی مدد آپ" کو اس میں کلیدی حیثیت حاصل ہے اور یہی اجتماعی ترقی کا بنیادی فلسفہ بھی ہے۔

بارش کا پہلا قطرہ

حکومت فرانس نے اشتراکی چین کو تسلیم کر لیا ہے۔ پیکنگ اور پیرس سے مشترکہ طور پر جاری ہونے والے ایک اعلامیہ میں بتایا گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات تین ماہ تک بحال ہو جائیں گے۔ ۱۹۴۹ء میں ماؤزے تنگ اور چو این لائی کی قیادت میں چین کے عوام اور محنت کشوں نے چین میں جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام کے خلاف ایک عظیم انقلاب برپا کیا تھا اور ان رجعت پسندانہ قوتوں کے حامی اور نشان مارشل چیانگ کائی شیک کو فارموسا کے چھوٹے سے جزیرے میں سمٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت مغربی بلاک نے چین کے اس انقلاب کو ہنگامی سمجھا اور یہ امید قائم کر لی کہ اشتراکی چین اپنی عظیم آبادی کے مسائل میں دب کر خود ختم ہو جائے گا یا مغربی بلاک کی قوتیں اسے ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ اس لیے انھوں نے مارشل چیانگ کائی شیک کی قیادت میں جزیرہ فارموسا کی حدود میں "آزاد چین" کی ایک حکومت قائم کرا دی اور مغربی بلاک کی تمام حکومتوں نے "تمثیلی" حکومت کو تسلیم کر کے اشتراکی چین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں مغربی بلاک نے اشتراکی چین کو دنیا میں تنہا اور اچھوت بنا کر اشتراکی چین کو ختم کرنے کے مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا۔ فرانس نے اسی زمانے میں اشتراکی چین کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کر لیے تھے۔ چین نے اس اقدام کا جواب اپنے آپ کو اقتصادی، سماجی، عسکری اور فنی لحاظ سے مضبوط کرنے کی بے مثال کوشش سے دیا۔ یہ علیحدگی چین کے لیے بڑی سازگار ثابت ہوئی۔ اسّی کروڑ نفوس پر مشتمل

آبادی فردِ واحد کی طرح اپنی خامیوں اور خرابیوں کو دور کرنے میں مصروف ہوگئی۔ چودہ سال کے مختصر عرصہ میں افیون کا رسیا چین جو جاپان کے سامنے چڑیا کی طرح بے بس تھا، ایک عظیم قوت بن کر عالمی سیاست میں اپنے جائز حق کا مطالبہ کرنے لگا۔

یہ بات پاکستان اور اس کے جواں سال وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے حق میں جاتی ہے کہ اس حکومت نے مشرقی ممالک میں سب سے پہلے اسی نئی ابھرتی ہوئی طاقت کی اہمیت کو محسوس کیا اور اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی مغربی ممالک کے ساتھ مکمل اور اندھا دھند تعاون کی ڈگر سے ہٹ کر بتدریج خود مختاری کی طرف بڑھنے لگی۔ اشتراکی چین کے ساتھ پُرامن سرحدی سمجھوتہ اور پھر پی۔ آئی۔ اے کے ذریعہ اشتراکی چین کے ساتھ فضائی معاہدہ، اس پالیسی کے نمایاں سنگِ میل ہیں، جنھوں نے پاکستان کو مغربی بلاک کی حاشیہ بردار حیثیت سے بلند کرکے آزاد اور خود مختار فضاؤں کے قریب کر دیا۔ اس ضمن میں ہمیں بھارت اور چین کی سرحدی جھڑپ کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے جس میں جوناگڑھ، مناوادر، حیدر آباد اور گوا کی فتوحات کے نشے میں بدمست بھارت نے زلزلہ آفریں شکست کھائی اور مغربی بلاک نے دائیں بائیں دیکھے بغیر بھارت کو اندھا دھند فوجی امداد دینا شروع کر دی۔ اس صورتِ حال نے ہماری حکومت کے پاس مغربی بلاک کے ساتھ اندھا دھند تعاون کا کوئی جواز نہ چھوڑا اور ہماری خارجہ پالیسی بتدریج پرانی ڈگر سے ہٹ کر آزادی اور خود مختاری کی طرف آنے لگی۔

بہر حال اس وقت خارجہ پالیسی میں اس معاملہ فہم تبدیلی کے کیوں اور کیسے سے بحث نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ مشرق میں مغربی بلاک کی بدنامی کی حد تک معروف حلیفوں میں سے پاکستان وہ پہلا ملک ہے جس نے اشتراکی چین کے متعلق مغربی بلاک کی پالیسی کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا اور اس کے ساتھ دوستی کے رشتے منقطع

کیے بغیر اس بلاک کے ساتھ مطلق اور مجرد تعاون سے گریز کر کے اپنے آزادانہ اور خود مختار وجود کا ثبوت بہم پہنچایا۔

مغربی بلاک کے حلیفوں کے حلقے میں یہ پہلی دراڑ تھی جس نے مغربی بلاک اور اس کے حلیفوں کے کان کھڑے کر دیے۔

ہم یہ دعوٰی نہیں کرتے کہ فرانس نے پاکستان کے اس اقدام سے متاثر ہو کر اشتراکی چین کو تسلیم کیا اور ان سفارتی تعلقات کی بحالی کا ارادہ کیا ہے جو ۱۹۴۹ء سے منقطع چلے آ رہے تھے۔ لیکن ہم اس بات کا دعوٰی کرنے میں یقیناً حق بجانب سمجھے جائیں گے کہ پاکستان نے اِن متعدد مشکلات کو دُور کرنے میں کچھ مدد ضرور دی ہے جو اشتراکی چین کو عالمی سیاست میں حصہ دار بننے کے راستے میں حائل تھیں۔ فرانس کی اس دلیل میں بڑی جان ہے کہ اسی کروڑ کی آبادی کو تا عمر اچھوت بنا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ بھی بڑی درست بات ہے کہ اس سے قبل اشتراکی چین کی حکومت کو باقاعدہ تسلیم نہ کرنے کے باوجود فرانس اس کے ساتھ تجارتی روابط رکھتا تھا۔ یہ بھی تسلیم کہ چواین لائی فرانس ہی کی ایک یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں اور ان پر فرانس کو اور فرانس پر ان کو بڑے حق حاصل ہیں۔ لیکن یہ سب باتیں پاکستان کے اس اقدام سے قبل بھی موجود تھیں اور یہ مجرد دلائل فرانس کو اشتراکی چین کے اس حد تک قریب نہیں لا سکے تھے۔ کہ فرانس اپنے سیاسی نظریات کے برعکس نظریات رکھنے والی حکومت کو تسلیم کرے۔ عالمی سیاست میں پاکستان کی طرف سے یہ مثبت اضافہ ہے کہ نظریات کے اختلاف کے باوجود دوستانہ تعلقات رکھے جا سکتے ہیں۔ اور ان تعلقات کے ذریعے امنِ عالم کے بقا و تحفظ کا سامان ممکن ہے۔

توقع کرنی چاہیے کہ مغربی ممالک کے دوسرے ملک بھی اس نظریئے کو دیانتداری کے ساتھ قبول کریں گے۔ فرانس کے اس اقدام پر مغربی بلاک کے اہم ممالک نے

(جن میں مغربی جرمنی، اٹلی، آسٹریلیا اور انگلستان کی لیبر پارٹی بھی شامل ہے)
جس ردِ عمل کا اظہار کیا ہے، وہ ہماری اس توقع کو بڑی تقویت پہنچاتا ہے اور ہم
سمجھتے ہیں کہ فرانس بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگا اور راتی کروڑ کی آبادی کو اچھوت بنائے
رکھنے کا نظریہ اب زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گا۔

(ہفت روزہ شہاب ۱۹۶۲ء)

چو این لائی کا دورۂ پاکستان

چین کے وزیرِاعظم مسٹر چو۔این لائی آج کل پاکستان کا دورہ کر رہے ہیں۔اس سے قبل ۱۹۵۵ء میں محترم موصوف کی تشریف آوری ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے سکون کا باعث ہوئی تھی لیکن اس وقت حالات کچھ اور تھے اور اشتراکی چین کے ۷۰،۸۰ کروڑ انسانوں کی یہ متحد اور متفق آواز وہ اہمیت حاصل نہ کر سکی تھی جو اسے اس دورے میں حاصل ہوئی۔مسٹر چو۔این لائی کا حالیہ دورۂ پاکستان تاریخِ پاکستان میں ایک نئے باب کا آغاز کر رہا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء میں ہم امریکہ کی جیبِ خاص کے مہمانِ خصوصی تھے۔ہمارے قریب ترین ہمسایہ بھارت میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کے وہ بلند آہنگ نعرے لگے تھے جن کی وجہ سے بین الاقوامی سیاسی آسمان سروں پر اٹھایا جا رہا تھا۔جنوب مشرقی ایشیا پر امریکہ کا ستارۂ اقبال اپنی پوری ضوفشانیوں کے ساتھ پرتو فگن تھا۔افریقی ایشیائی ممالک کی بہت تھوڑی تعداد نوآبادیاتی نظام کے چنگل سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوئی تھی۔بنڈونگ کانفرس ابھی نہیں ہوئی تھی اور اس کے اثرات ابھی تک مستقبل کے پردے میں پوشیدہ تھے،صدر ناصر کی شخصیت ابھی تک پوری طرح اجاگر بھی نہیں ہوئی تھی اور پنڈت نہرو اپنے آپ کو ایشیا کا لیڈر بنانے یا سمجھنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھے۔اس عالمی صورتِ حال میں اشتراکی چین کے وزیرِاعظم کی تشریف آوری "کرٹسی کال" یا ایک امن دوست ہمسائے کی "سلام علیک" سے زیادہ حیثیت اختیار نہ کر سکی اور عالمی دھارے

کے یک سمتی بہاؤ پر اس کا کوئی نمایاں اثر نہ ہو سکا۔

اب دنیا کی تصویر یکسر بدل چکی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں کانگو کے علاقے غیر جانبداری کا اعلان کر چکے ہیں۔ مغربی ممالک کے ایک اہم ملک فرانس نے اشتراکی چین کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لیے ہیں اور صدر ڈیگال نے جنوب مشرقی ایشیا میں قیامِ امن کے لیے غیر جانب داری کو ضروری قرار دے دیا ہے۔ فلپائن کے صدر کے ساتھ صدر ڈیگال کی خط و کتابت شروع ہو چکی ہے جس میں صدر ڈیگال نے اپنی پالیسی کی افادیت پر اظہارِ خیال شروع کر دیا ہے۔ یہ صورتِ حال کیا رنگ لائے گی اور جنوب مشرقی ایشیا مستقبل قریب میں اشتراکی چین کے متعلق کیا رویہ اختیار کرے گا؟ یہ بہرحال ظن و تخمین کا موضوع ہے لیکن یہ قطعی بات ہے کہ امریکہ کی بلا اشتراک برتری کا سورج ڈھلنے لگا ہے اور امریکی ڈالر زیادہ دیر تک اس سورج کو نصف النہار پر قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ اس کے علاوہ متعدد افریقی ممالک آزاد ہو کر اقوامِ متحدہ کے رکن بن چکے ہیں اور اب اس ادارے میں ووٹوں کی تعداد ایک سو دس تک بڑھ چکی ہے۔ نوآبادیاتی نظام ہمیشہ کے لیے ختم ہونے کو ہے۔ اور جو چند ممالک باقی ہیں وہ بھی جلد آزاد ہو جائیں گے۔ بھارت میں تبت کے دلائی لامہ کی آمد نے "چینی ہندی بھائی بھائی" کے نعرے کو یک لخت خاموش کر دیا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں نیفا کے سرحدی علاقوں میں بھارت کی عاجلانہ اور غلط حکمت عملی نے اس آواز کو جدال و قتال کی آوازوں میں بدل دیا اور روسی امریکی بلاک کی گرم جنگ جو کاسٹرو کے علاقے پر منڈلا رہی تھی یک لخت نیفا کی سرحدوں پر اس انداز میں منتقل ہوئی کہ امریکی بلاک چینی اشتراکیت کے مقابلہ میں آ گیا۔ روس اور امریکہ کے درمیان متعدد مصالحانہ کوششوں میں راستے ہموار ہو گئے۔ اس کشمکش میں بھارت کی غیر جانبداری کی ہنڈیا چوراہے میں پھوٹ گئی اور پنڈت نہرو ایشیائی قیادت کے امکانات سے بہت دور دھکیل دیے گئے۔ اب اس میدان میں

ایک طرف چو۔ این لائی ہیں اور دوسری طرف صدر ناصر۔ مسٹر چو این لائی اسی کروڑ چینی آبادی کے قائد ہیں۔ صدر ناصر عرب ممالک کے درمیان اتحاد کی طرح ڈال کر قوت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ امریکہ کے نقطۂ نظر سے یہ دونوں تیزی سے ابھرتے ہوئے لیڈر امریکی بلاک سے زیادہ قریب نہیں۔ بلکہ اس کے مخالف کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مشرقِ بعید سے لے کر مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے مغربی ساحلوں تک کے علاقے میں سامراجی اثر و نفوذ کو چو۔ این لائی کے پہلے اور حالیہ دورے کے درمیانی عرصے میں ایک تدریجی زوال ہوا ہے اور یہ زوال اب اپنے آخری کناروں پر لرزنے لگا ہے۔

حکومتِ پاکستان نے اس صورتِ حال کا نہایت دانشمندی کے ساتھ جائزہ لیا۔ اور اپنی خارجہ پالیسی کو بروقت ایک حقیقت پسندانہ طریقے سے بدل دیا۔ پاکستان امریکہ کا دوست ہے اور ان معنوں میں "سیٹو" اور "سنٹو" کا رکن ہے کہ یہ دفاعی معاہدے صرف اشتراکیت ہی کے حملے کے دفاع کے لیے نہیں بلکہ ہر قسم کی جارحیت کا دفاع کرنے کے لیے کیے گئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دوستوں کے انتخاب میں آزاد ہے اور ہر اس ملک کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے گا۔ جو دنیا میں قیامِ امن کے مقصد سے دوستی کا طلب گار ہوگا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ دوستی کے لیے کبھی اپنے اصولوں کی قربانی نہیں دے گا۔

اشتراکی چین کے وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ کا حالیہ دورہ ایک ایسے دوست کی کی تشریف آوری ہے جو اس حصۂ ارض میں قیامِ امن کے لیے اپنے ہمسایوں کے ساتھ دوستی کا خواہاں ہے۔ پاکستان آج محض ایک امن دوست ہمسائے کی "کرٹسی کال" کا استقبال نہیں کر رہا بلکہ ایک دوست کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ جو کشمیر کے مسئلے میں اس کے نقطۂ نظر سے متفق ہے۔ اندرونی ترقی اور استحکام

کے لیے بیرونی امن کی خواہش کا اظہار کرتا ہے اور عالمی سطح پر اس کی اس مؤثر حیثیت کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ اس کے اور امریکہ کے باہمی تنازعات میں تخفیف کرنے کی بھرپور کوشش کرکے اسے عالمی ادارہ کا رکن بنوانے میں مؤثر کردار ادا کرسکتا ہے۔

(ہفت روزہ شہاب ۱۹۶۴ء)

چینی علماء کی پاکستان میں تشریف آوری

•

عوامی جمہوریہ چین کے مسلمان علماء کا ایک خیرسگالی کا وفد ارضِ پاکستان میں وارد ہوا اور پاکستان کے دینی حلقوں کی طرف سے دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ یہ پاکستانیوں کا فرض تھا۔ ایک دوست ملک کی طرف سے تشریف لانے والے دینی بھائیوں کی پذیرائی کے لیے ہم جو بھی کرتے، تھوڑا تھا۔ بلکہ ہمیں اس بات کا جائز طور پر افسوس ہے کہ ہم اپنے جذبات و احساسات کے اظہار میں وہ کچھ نہیں کرسکے جو ہمیں کرنا چاہیے تھا اور جو ہم کرنا چاہتے تھے۔

وفد کے قائد جناب محمد علی چیک جیج نے تقریباً اپنے ہر خطبے میں ہمیں یہ خوشخبری دی ہے کہ چین کے عوامی اور حکومتی حلقوں کا ہر طبقہ پاکستان کا احترام کرتا ہے اور اس کے مسائل کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتا ہے۔ چین ہر آڑے وقت میں ہمارے ساتھ ہوگا اور کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کی حمایت چین کا جزوِ ایمان ہے۔ ہم ان جذبات کے لیے اپنے عزیز اور عظیم ہمسائے کے تہِ دل سے ممنون ہیں۔

چینی وفد نے ہمیں یہ خوش خبری بھی سنائی ہے کہ عوامی جمہوریہ چین میں مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے اور وہ اپنے عقائد اور معتقدات کے مطابق مذہبِ حقّہ پر پختگی سے قائم ہیں۔ چین میں سینکڑوں مسجدیں ہیں جو نمازیوں سے بھری رہتی ہیں اور چین کے مسلمان دن میں پانچ وقت اپنے دینی مرکز کی طرف منہ کر کے اِس پیغام کو یاد کرتے ہیں جس پر دنیا کی تقریباً نوّے کروڑ آبادی کا ایمان ہے اور جو اس نوّے کروڑ آبادی کا ایسا نقطۂ اتصال ہے جس کو مغرب کی حربی، سیاسی، علمی اور نفسیاتی سازشیں کمزور نہ کرسکیں اور

جو آج بھی اپنے پورے جلال و کمال کے ساتھ دنیا کی اس بہت بڑی اقلیت کو زندگی کا پیغام دیتا ہے۔

چینی وفد کے قائد نے پاکستانی مسلمانوں کو یہ بہت بڑی خوش خبری دی اور حق یہ ہے کہ اس خطۂ ارض میں رہنے والوں کے ایک بہت بڑے سوال کا نہایت تسلی بخش جواب دیا ہے۔ ہم یہ سن کر یقیناً بے حد مطمئن ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ ہمارے یہ بھائی اپنے وطن میں مطمئن اور خوش رہیں اور اپنے وطن کی ترقی اور تعمیر کے کام میں اپنے ہموطنوں کا ساتھ اسی دیانت داری اور محبِ وطن سے ادا کرتے رہیں جس کا تقاضا ان سے ان کا دین بھی کرتا ہے اور ان کی دنیا بھی۔

اس موقع پر ہم بعض معروضات نہایت ادب سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں تشریف لانے والے ہمارے یہ بھائی اپنے ناموں کے آخری حصے اور شکل و شباہت کے اعتبار سے عظیم چین کے اس حصے کے رہنے والے معلوم ہوتے ہیں جن کا زیادہ حصہ، جسے چینی مؤرخ حقیقی چین کے نام سے یاد کرتے رہتے ہیں۔ جمہوریہ چین ہوانگ ہو اور یانگسی کیانگ جیسے بڑے بڑے دریاؤں کے طاسوں میں آباد ہے۔ ان علاقوں میں آباد چینی مسلمان قدیم زمانے سے چین کی نمایاں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور نسلی اعتبار سے حقیقی چینیوں سے بہت قریب ہیں۔ ان مسلمانوں نے چین میں بادشاہت کے دور کے وہ تمام شدائد برداشت کیے ہیں جو حکمران خاندان چینی عوام پر نازل کیا کرتے تھے۔ ان قبائل کے کاشتکاروں نے حکمران خاندانوں کے مالی، جسمانی اور سیاسی استبداد کے خلاف ان تمام انقلابی تحریکوں کا ساتھ دیا۔ جو چینی تاریخ کا خاصہ ہیں۔ سوشلسٹ انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنے کی خاطر ان میں ہزاروں نے نہیں لاکھوں نے اپنے قیمتی اور مقدس خون کی قربانی دی اور موجودہ حکومت ان کی جان فروشیوں کی مداح اور معترف ہے۔ وہ آج بھی اپنے عظیم وطن کی تعمیر و ترقی میں

اپنے ہم وطنوں کے شانہ بشانہ میدانِ عمل میں موجود ہیں۔

لیکن ان کے ساتھ ساتھ چین کی مسلمان آبادی کا بہت بڑا حصہ وہ بھی ہے جو حقیقی چین کا رہنے والا نہیں بلکہ اس کے سرحدی علاقوں میں آباد ہے اور جسے چینی ترکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس علاقے کے شہر کاشغر وغیرہ ہیں اور یہ علاقہ آج کل صوبہ سنکیانگ کا حصہ ہے۔ یہ لوگ ترکی النسل ہیں۔ برِصغیر پاکستان و ہندوستان کے مسلمان کاشغر جیسے شہروں کے تمدن اور ان علاقوں کی معاشرت کے وارث اور جانشین ہیں۔ ہماری فکری، شعری اور ثقافتی زندگی کا بہت بڑا حصہ ان علاقوں کا مرہونِ منت ہے۔ ہمارے بڑے بڑے صوفیا اور مذہبی مفکر اسی علاقے سے متعلق ہیں جو کبھی وسطی ایشیا اور عربوں کے ہاں ماوراء النہر کہلاتا تھا اور جو بعد میں روس اور چینی ترکستان میں تقسیم ہو کر اسلامی دنیا سے کٹ گیا۔ ظاہر ہے کہ عربوں کے بعد برِصغیر میں اسلامی فکر و تصوف اور ثقافت و تمدن کے اس دوسرے سب سے بڑے منبع کے متعلق سننے اور جاننے کی خواہش ہمارے دلوں میں خاصی حقیقی ہونی چاہیے اور ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس علاقے کے لوگوں سے بھی ہم ملیں اور ان کے منہ سے بھی ان کے حال احوال سنیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس علاقے کے رہنے والے بھی خوش و خرم ہوں گے اور ہمیں وہی خوش خبری دیں گے جو موجودہ وفد کے قائد نے دی ہے۔ کیا اپنی حکومت کی وساطت سے حکومتِ چین سے یہ گذارش کرنا نامناسب ہوگا کہ وہ سنکیانگ کے علاقے کے مسلمان علماء کے وفود کا بھی پاکستانی علماء کے وفود سے تبادلہ کرے اور ان دونوں علاقوں میں رہنے والوں کو ملنے کا موقع دے تاکہ یہ دونوں قریبی ہمسائے ذہنی اور جذباتی طور پر بھی زیادہ سے زیادہ قریب آسکیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارا محکمہ امورِ خارجہ اس امر کے تمام تقاضوں پر غور کرنے کے بعد ہماری اس گذارش کو عوامی جمہوریۂ چین کی حکومت تک پہنچانے میں کوئی حرج نہیں محسوس کرے گا۔

(ہفت روزہ شہاب ۱۹۶۶)

چینی کتابوں کی نمائش پر خطاب

۲۹ ستمبر ۱۹۷۴ء کو راولپنڈی میں چینی کتابوں
کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے ایک مختصر خطاب

عوامی جمہوریہ چین کے ۲۵ ویں جشنِ استقلال پر نیشنل پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے منعقدہ چینی کتب کی نمائش کا افتتاح میرے لیے بسببِ اعزاز بھی ہے اور باعثِ افتخار بھی!

چین میں جو انقلاب آیا ہے وہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا انقلاب متصور ہوتا ہے۔ یہ صرف چیئرمین ماؤ کی ذاتی فتح ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے محنت کشوں، کسانوں اور کارکنوں کی کامرانی کا نشان ہے۔ دنیا جس طرح اس انقلاب سے متاثر ہوتی ہے کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس نے وقت کے بہتے ہوئے دھارے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ہمیں امید ہے اور اس بات کی تمنا بھی ہے کہ چینی عوام چیئرمین ماؤ کی عظیم قیادت میں اس عوامی انقلاب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرتے رہیں

چین کو بجا طور پر فخر ہے کہ وہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا حامل ہے۔ حکمت و دانائی کی چھاپ رکھنے والا چینی ادب دنیا کے ہر خطے میں اپنے قاری کے لیے وجہِ فیضان ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی طرح چین کا جدید ادب بھی ان تمام "ریڈرز اور لیڈرز" کے لیے یکساں موجبِ کشش ہے جو انقلابی جدوجہد کا اہم کام سرانجام دے رہے ہیں۔

میں جب وزیرِ اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پاکستان کی عوامی تحریک میں حصہ لے رہا تھا تو مجھے اس ادب کی چند کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ کتابیں مجھے بہت مفید اور کارآمد نظر آئیں۔ ان میں ایسے افکارِ تازہ کی فراوانی ہے جو نو بہ نو ہونے

کےعلاوہ پڑھنے والے کے ذہنی اُفق کو بھی وسیع کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ہر اس شخص کو جو عوامی مسائل کو حل کرنے کا خواہاں ہے، ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

ستمبر ۱۹۷۰ء میں جب یحییٰ حکومت نے مجھے پانچ سال کے لیے قید بامشقت میں ڈال دیا تھا تو میں جیل کی کال کوٹھڑی میں بیٹھا قرآنِ حکیم کے علاوہ "ماؤ کی منتخب کتابیں" پڑھا کرتا تھا۔ اور اس تنہائی کے عالم میں یہ تقابلی مطالعہ میرے لیے بڑی دلچسپی کا حامل تھا۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ انسانی معاشرے کو ہر طرح کے تضادات سے پاک ہونا چاہیے۔ یہی نظریہ چیئرمین ماؤ کا بھی ہے۔ اس طرح عملی طور پر ہم نے اس صداقت کو پا لیا ہے کہ آزاد سماج کا یہ مسئلہ فطری طور پر اسلامی معاشرے میں بھی موجود ہے اور انقلابِ چین بھی اسی کا آئینہ دار ہے۔

ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی بھی ہے کہ ہمیں علم حاصل کرنا چاہیے اس جستجو میں چاہے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ میری خوش نصیبی کہ چین کی جانب پی۔ آئی۔ اے کی افتتاحی پرواز کے موقع پر خیرسگالی کے ایک وفد کے ہمراہ ۱۷ سے ۲۳ فروری ۱۹۷۳ء کے دوران ہفتہ بھر کے لیے مجھے چین جانے کا اتفاق ہوا۔ اپنے عرصۂ قیام میں وہاں کے حالات دیکھ کر میں اس قدر متاثر ہوا کہ وطن واپس آ کر "ایک ہفتہ چین میں" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ دی جو میرے دورۂ چین کے تاثرات پر مشتمل تھی۔ اس کتاب میں واضح طور پر میں نے لکھ دیا ہے کہ چین کا انقلاب بنی آدم کی مشترک میراث ہے۔ چینی عوام اپنے ملک میں جو انقلاب لائے ہیں، وہ ہمارے خیال میں تاریخ کا ایک عظیم تجربہ ہے اور ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ میں نے اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ آفتاب مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے لیکن پاکستان اور چین ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔

چینی اور پاکستانی عوام کے حق میں یہ بہت بہتر ہو گا کہ وہ اپنی تہذیب و ثقافت

کے بنیادی عناصر کو پہچانیں اور ان میں اشتراکِ عمل کی راہیں تلاش کریں۔ اس باہمی اشتراک ہی سے ہم اپنی انفرادیت اور اپنے کردار کو بچانے کی امید کر سکتے ہیں اور نہ اس کے ساتھ ہی اپنے عوام کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے جدید ایٹمی دور میں داخل ہونے کے لیے تیار بھی کر سکتے ہیں جس کے سبب ہم اپنی آزادی برقرار رکھنے، اپنے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے اور سب سے بڑھ کر ایک ایسی مکمل اور پرسکون زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو مادی احتیاج اور ذہنی جمود کی فضا سے آزاد ہو۔

مجھے یقین ہے کہ چینی کتابوں کی اس نمائش سے چین اور پاکستان کی دوستی کے رشتے اور زیادہ مضبوط ہوں گے۔ خوشی کا مقام ہے کہ پاک چین تعلقات کو بین الاقوامی سیاست میں مثالی حیثیت حاصل ہے۔ سیاسی تعاون اور باہمی مفاہمت کی وجہ سے ایسے امکانات روشن ہو رہے ہیں جو اقتصادی اور ثقافتی اشتراک بڑھانے میں ممدّ و معاون ثابت ہوں گے۔

پاک چین تعلقات محض اصولوں پر مبنی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وقت کی گردش انہیں متاثر نہیں کر سکی۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے واقعات اس کے شاہد ہیں اور آج بھی جبکہ ہم دقتوں سے دوچار ہیں، چینی عوام کی دوستی ہی ہے جو ہمارے لیے وجہ سکون و استمداد ثابت ہو رہی ہے۔

پاک چین دوستی زندہ باد!

دو عظیم قائد
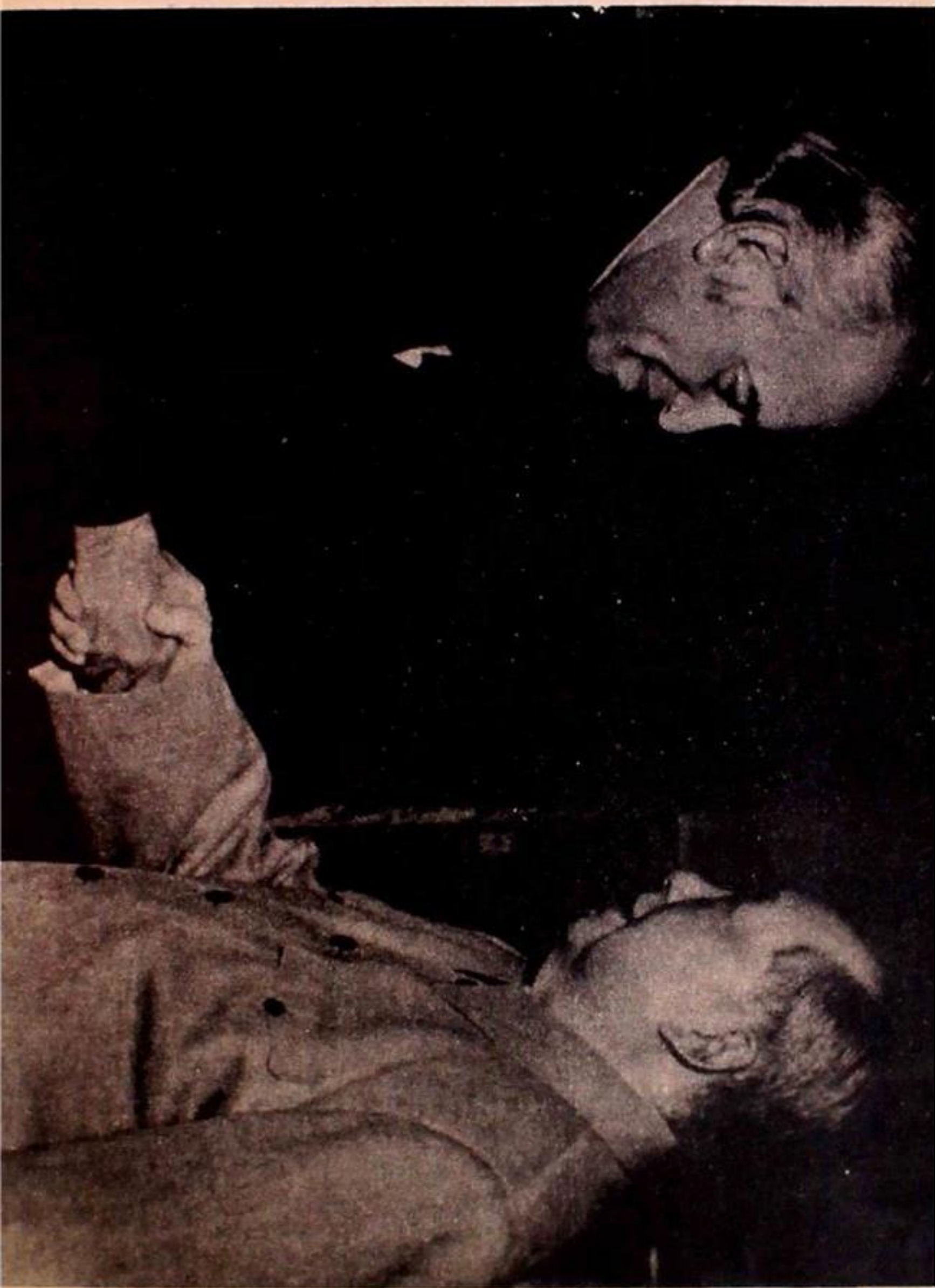
"فروری ۱۹۷۴ء میں پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز نے پیکنگ کے لیے جو نئی سروس شروع کی تھی، اس کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے ایک وفد چین گیا تھا۔ خاتونِ اوّل بیگم نصرت بھٹو اس وفد کی لیڈر تھیں۔ مرکزی وزیرِ اطلاعات ونشریات، اوقاف وحج کی حیثیت سے میں بھی اس وفد میں شامل تھا۔ چین میں اپنے ایک ہفتہ کے دوران قیام جو کچھ میں نے محسوس کیا اسے ایک ڈائری کی شکل میں لکھ لیا تھا۔ یہ ڈائری پہلے بھی چھپ چکی ہے۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن ہدیہ قارئین ہے۔"
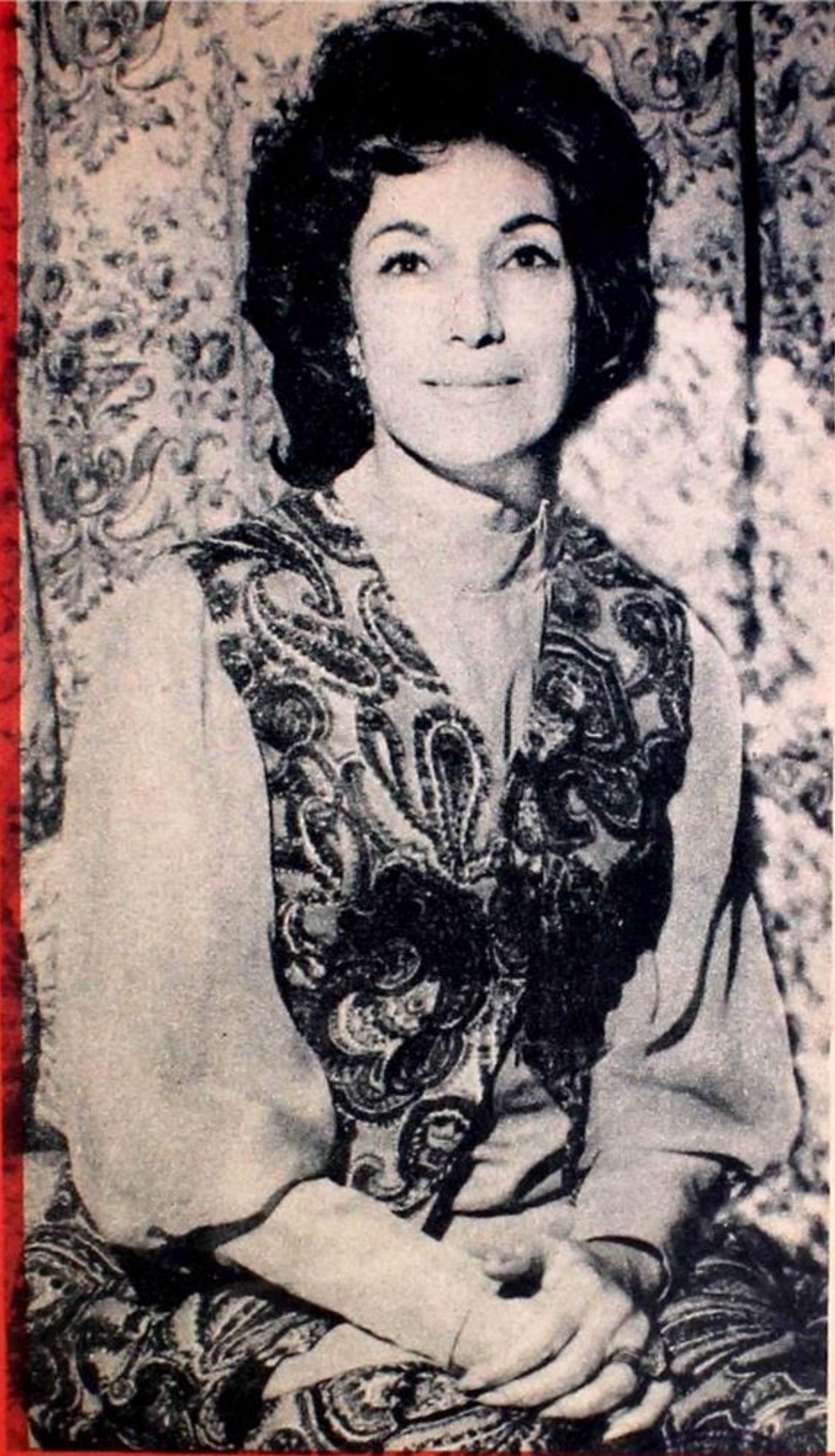
بیگم نصرت بھٹو، وفد کی لیڈر

اُطلبو العلم ولو کان بالصّین

علم حاصل کرو!

چاہے اس کے لیے چین ہی

کیوں نہ جانا پڑے ـــــ

پیکنگ کے ہوائی اڈہ پر چینی بچے پاکستانی وفد کا استقبال کر رہے ھیں

۱۷ فروری ۱۹۷۳ء

آج صبح کو روانگی تھی،

چند روز پیشتر پریذیڈنٹ صاحب نے فون کیا اور پوچھا،

"چین جاؤ گے؟"

میں نے کہا:

"سر! آپ بھیجیں گے تو کیوں نہیں جاؤں گا۔"

بولے:

"تو پھر پی۔ آئی۔ اے کی افتتاحی پرواز سے چین جانے کے لیے تیار رہو۔"

مولانا کوثر نیازی
ڈپٹی لیڈر

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائینز نے پیکنگ کے لیے اپنی سروس شروع کرنے کا جو پروگرام بنایا تھا، یہ اس کی افتتاحی پرواز کا ذکر تھا۔

پی۔ آئی۔ اے کے عملے کو چھوڑ کر کل ۴۶ مہمان جہاز میں سوار تھے۔ بیگم نصرت بھٹو وفد کی لیڈر تھیں اور میں ڈپٹی لیڈر۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ ملک معراج خالد بھی اسی وفد میں شامل تھے۔

اسلام آباد سے پیکنگ تک کا پانچ گھنٹے کا سفر بڑا دلچسپ رہا۔ قراقرم کی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ خاص طور پر دل کش تھا۔ پیکنگ پہنچے تو یہاں بھی ہر طرف برف ہی برف نظر آئی۔ موسم بے حد خنک تھا۔ لیکن چینی عوام نے پرجوش استقبال کے ذریعے اس میں اپنے جذبات کی گرمی گھول دی تھی۔

ایئر پورٹ پر اترے تو دیکھا کہ خوب صورت بچوں اور بچیوں کے منظم گانے اور رقص کرتے ہوئے دستے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پھول تھے اور مجھے شاعر کا یہ شعر یاد آ رہا تھا ؎

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

صحت کی سرخی بچوں کے گالوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور جب وہ رقص کرتے ہوئے رنگ برنگے پھول فضاؤں میں لہراتے تھے تو بچوں کے چہروں اور پھولوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔

جہاز ہی میں ہم لوگوں کو سرکاری اور غیر سرکاری دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ سرکاری جماعت میں بیگم بھٹو اور مجھ سمیت کل گیارہ افراد ہیں۔ ہمیں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا ہے اور دوسرے لوگوں کو پیکنگ ہوٹل میں۔ گاڑیوں پر باقاعدہ نمبر لگے ہوئے ہیں۔ پہلی گاڑی بیگم صاحب کی ہے اور دوسری میری۔ میرے ساتھ ایک ترجمان بھی ہے۔

ایئرپورٹ سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس تک گاڑی کے شیشوں سے پیکنگ کا ایک طائرانہ جائزہ لیا۔ فراخ سڑکیں، منضبط ٹریفک، ناک کی سیدھ میں جاتے ہوئے اپنے کام سے غرض رکھنے والے لوگ، بلند و بالا مگر سادہ و پروقار عمارتیں، بڑے بڑے بورڈوں پر چینی زبان میں لکھے ہوئے چیئرمین ماؤ کے اقوال، موسمِ خزاں کی زد میں آئے ہوئے سڑکوں کے دو رویہ خشک درخت اور درختوں کی ٹہنیوں پر برف کی چاندی ——— یہ میرا حاصلِ نظارہ ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں میرے سوئیٹ میں راحت و آرام کی ہر چیز مہیا ہے۔ سگرٹ، پھل، ٹافیاں، کاغذ، قلم، اخبار، میگزین اور ریڈیو، یہاں تک کہ غسل خانہ جانے کے لیے گاؤن اور چپل بھی موجود ہیں۔

یہاں کا وقت پاکستان سے تین گھنٹے آگے ہے۔ ہم اپنے وقت کے حساب سے ڈیڑھ بجے یہاں پہنچے تھے لیکن یہاں اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔

سات بجے پیکنگ ہوٹل میں نیشنل ایئرلائینز کی طرف سے استقبالیہ تھا۔ چین کے نائب وزیرِ اعظم اور نائب وزیرِ خارجہ بھی شریک ہوئے۔ چین ایئرلائینز کی طرف سے اس کے سربراہ نے اور ہماری طرف سے درویش صفت معراج خالد نے اظہارِ خیال کیا۔

معراج تو ویسے بھی چینی طرز کی پوشاک میں ملبوس رہتے ہیں اور اس ملک میں برسوں سے پاک چین دوستی کے مخلص داعی رہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ان کی باتیں دلوں

میں گھر کر گئیں۔

چینی کھانا مجھے پسند ہے۔ پاکستان کے چینی ہوٹلوں میں اکثر جانے کا اتفاق ہوا ہے لیکن وہ کھانے تو چین کے اصل کھانوں کے مقابلے میں ع

کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

کا مصداق ہیں۔ آج کے استقبالیہ میں چینیوں کی خوش خوراکی کا صحیح اندازہ ہوا۔ کورس اتنے تھے کہ دو گھنٹے جاری رہے مگر کیا مجال کہ معدے پر بوجھ بنے ہوں۔ ان کھانوں میں لذت بھی ہے اور غذائیت بھی ——— اور انہیں پیش کرنے کا انداز بھی ایسا ہوتا ہے کہ خود بصارت بھی اِس سے محظوظ ہوتی ہے۔

پیکنگ ہوٹل میں چین کی نیشنل ایئرلائنز کی طرف سے پاکستانی وفد کے اعزاز میں استقبالیہ

عوامی جمہوریہ چین کے نائب وزیرِ اعظم، مولانا
کوثر نیازی کا استقبال کر رہے ہیں

فاروق کی یاد اس سفر میں قدم قدم پر تڑپاتی رہی۔ وہ ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ چین لے کر آتا۔ کس بات پر اس کا ردِ عمل کیا ہوتا، تصور کی دنیا میں اس کی طرف سے حسبِ حال فقرے اور قہقہے میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ گیسٹ ہاؤس کی تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ بہت کوشش کرتا ہوں کہ مطالعہ میں دل لگاؤں مگر کتاب کی سطروں کے درمیان اس کا معصوم چہرہ نظر آتا ہے۔ اٹھارہ سال کی رفاقت کا کون کون سا نقش دل سے مٹاؤں!

ساتھی سمجھتے ہوں گے —— ٹھیک ٹھاک ہی تو ہے۔ ہنستا بولتا ہے۔ اسی طرح ادائے فرض میں مشغول ہے مگر انھیں کیا خبر دل کا کیا عالم ہے!

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گزرتی ہے

پاکستانی وفد "چنگ شہنشاہیت" کے زمانہ کی یادگار سمر پیلس میں

۱۰ر فروری ۱۹۷۳ء

آج صبح "سمر پیلیس" دیکھنے کا پروگرام تھا۔ یہ چنگ شاہنشاہیت کے زمانے کی یادگار ہے جو آج سے ڈھائی پونے تین سو سال پہلے تعمیر ہوئی تھی محل کی یہ عمارت کوئی تین سو ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہے۔ایک چوتھائی میں باغ اور محل بنا ہوا ہے اور ۳/۴ حصے میں جھیلیں ہیں۔جھیلوں کا پانی سخت سردی کی وجہ سے جم گیا تھا۔ لوگ اس کے اوپر چل پھر کر تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ محل میں ہم نے شہنشاہِ چین کا تخت وتاج اور ظروف و آلات دیکھے۔ قیمتی پتھروں سے بنے ہوئے سیاہ پردے، ہیروں اور موتیوں سے ترشے ہوئے پتے اور پھول دیکھ کر نقل پہ اصل کا گمان گزرتا تھا۔ ہمارا گائیڈ مزے لے لے کر لنترانی کر رہا تھا کہ یہ شہنشاہ کے کھانے کا کمرہ ہے،ایک وقت میں سو قسم کے کھانے رکھے جاتے تھے اور یہ پھل رکھنے کے برتن ہیں مگر یہ سب کچھ وہ کھا نہیں پاتا تھا۔

سمر پیلس کے باہر خوبصورت جھیل اور باغ کا منظر

ان میں سے کچھ چیزیں تو وہ کھا لیا کرتا تھا اور کچھ کو وہ سونگھ کر ہی لطف اندوز ہو جایا کرتا تھا۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں اس کے خدام قطاریں باندھے کھڑے رہتے تھے۔ محل میں اس کے نوکروں کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی!"

"یہاں لوگ اس کے درشن کے منتظر رہتے تھے!"

معلوم ہوتا ہے شہنشاہوں کے طور اطوار ہر ملک میں ایک ہی جیسے ہوا کرتے تھے۔ سلطانی جمہور کے موجودہ زمانے میں ان لوگوں کے لچھن دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی شہنشاہیت قائم رہی ہے لیکن چین میں تو اس کی جڑیں بہت ہی مضبوط تھیں۔ ایسے پلے ہوئے معاشرے میں انسان کی عظمت کے گیت گانا چیئرمین ماؤزے تنگ کا ہی کام تھا۔ "سمر پیلس" کے معائنہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ عظیم چینی عوام نے اپنا سفر کن پستیوں سے شروع کیا تھا۔

شام کو پانچ بجے۔ پی۔ آئی۔ اے کی طرف سے استقبالیہ دعوت تھی۔ چین کے نائب وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ کے علاوہ نائب وزیرِ تجارت، نیو چائنہ نیوز ایجنسی کے سربراہ اور بہت سے عمائدین بھی یہاں موجود تھے۔

کل ہمارے وفد کی طرف سے ملک معراج خالد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ آج بیگم صاحبہ کا حکم تھا کہ میں وفد کی نمایندگی کروں۔ سخت مرحلہ صرف جامِ صحت تجویز کرنے کا تھا مگر جب یہ اس قوم کی روایت ہے تو تھوڑا بہت ہمیں بھی ان کی خاطر اپنے ذوق کو قربان کرنا ہی پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ اہتمام ممکن تھا کہ میرے جام میں سادہ پانی ہو۔

کل میرے دوست معراج خالد نے اپنی تقریر اردو زبان میں کر کے قومی انا کا مظاہرہ کیا تھا —— اور میں تو پہلے ہی اردو پر جان دیتا ہوں۔ تقریر ہوئی مگر رسمی انداز میں۔ پاکستانی سفیر آغا شاہی نے مجھے تقریر کا مسودہ انگریزی میں دیا تھا۔ میں

نے اسے اردو کا جامہ پہنا دیا۔

استقبالیہ کوئی شام کے سات بجے ختم ہوا۔ آٹھ بجے چینی فن کاروں کی طرف سے وفد کے اعزاز میں ایک بیلے دکھایا گیا۔ اس میں ایک مظلوم عورت کی داستان بیان کی گئی تھی جو جاگیرداری کے عہد میں ظالموں کے ہاتھوں ستائی جاتی ہے۔ آخر وہ فرار ہو کر ایک ایسی جگہ پہنچتی ہے جو عوامی انقلابی تحریک کا صدر مقام ہے۔ اس تحریک میں وہ شامل ہو کر قربانیاں دیتی ہے، یہاں تک کہ اسے ستانے والے ظالم جاگیردار کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جاتا ہے۔
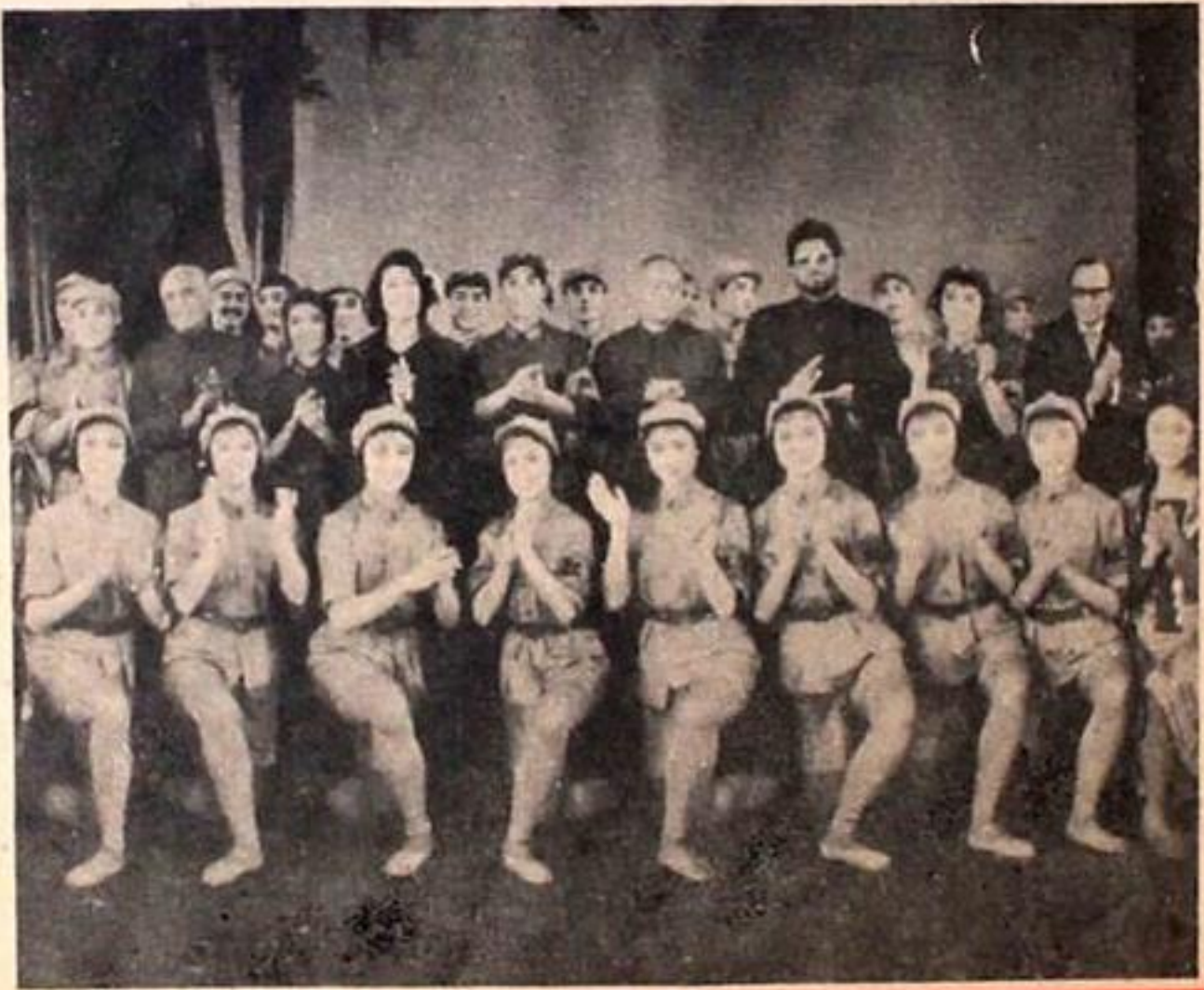
"چینی فن کار اربابِ نشاط میں سے نہیں، وہ ایک عالمگیر تحریک کے دست و بازو ہیں" بیگم بھٹو، مولانا کوثر نیازی، ملک معراج خالد اور دوسرے چینی فنکاروں کے ساتھ

چینی انقلاب نے جہاں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے، وہاں فن کی دنیا میں بھی اس نے منفرد اسلوب کو جنم دیا ہے۔ یہاں کے آرٹسٹ منجملۂ ارباب نشاط نہیں۔ وہ ایک عالم گیر تحریک کے دست و بازو ہیں۔ مقصد کے عشق نے ان کے فن میں غضب کا نکھار پیدا کر دیا ہے۔ میں بیلے دیکھ رہا تھا اور علامہ اقبال کا یہ شعر بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہا رہا تھا۔

نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

بد قسمتی سے ہمارے ہاں عریانی و فحاشی کو جس طرح فن کی معراج سمجھ لیا گیا ہے، اس کے بعد لباس اور اداکاری میں یہ پاکیزگی دیکھ کر میں تو پانی پانی ہو گیا۔ سو اداکاروں میں نصف کے قریب خواتین ہوں گی لیکن کیا مجال کہ انھیں دیکھ کر کسی ذہن میں جنسی خیال بھی گزرا ہو۔

اور ـــــــ ایک ہمارے فن کار ہیں کہ
آہ ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار۔

"چینی عوام نے بیگم بھٹو کے لیے ایک نئی موسیقی ایجاد کر دی میں بیگم بھٹو کی شرافت اور لیاقت کا تو قائل تھا ہی مگر چین کے دورے میں انہوں نے جس پُر اعتماد انداز میں ہماری نمائندگی کی، اس سے پاکستانیوں کے سر فخر سے بلند ہو گئے"

مولانا کوثر نیازی اپنے رفقا کے ساتھ "منگ" شہنشاہوں کے مقبروں کے سامنے کھڑے ہیں

آج صبح دیوارِ چین اور من ٹو مبز (من بادشاہوں کے مقبرے) دیکھنے کا پروگرام تھا۔ بیگم بھٹو کو ڈاکٹر کسنجر اور وزیرِ اعظم چو۔ این لائی سے ملنا تھا، اس لیے قافلہ ان کے بغیر ہی روانہ ہوا۔ مسٹر بھاٹی آج میرے لیے لبریشن آرمی کا سبز گرم کوٹ اور ٹوپی

پاکستانی وفد کے ارکان دیوارِ چین کے پہلو میں کھڑے ہیں

ے آئے تھے تاکہ دیوارِ چین کی بلندیوں پر چڑھتے ہوئے شدید سردی کا مقابلہ کیا جا سکے۔ گھنٹے سوا گھنٹے میں پہاڑوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے دیوارِ چین تک پہنچ گئے۔

دیوار کیا ہے ؟ انسانی عزم و ہمت کا منہ بولتا شاہکار !

پہاڑوں کے اوپر بل کھاتی ہوئی یہ دیوار جو چھ ہزار میٹر میں پھیلی ہوئی ہے اب سے ۲۲۰۰ سال پہلے تعمیر ہونا شروع ہوئی تھی۔ پیکنگ کے شمال میں "شان ہان کوان" سے شروع ہو کر مغرب میں ۱۵۰۰ میل تک چلی گئی ہے۔ اس کا زیادہ حصہ کچی مٹی کا بنا ہوا ہے لیکن حسبِ ضرورت اسے مضبوط بنانے کے لیے کہیں کہیں بڑے پتھر بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ دیوار اہلِ چین کو منگولیا کے حملہ آوروں سے بچانے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اکثر مقامات پر دیوار اتنی چوڑی ہے کہ مکان کی اچھی خاصی چھت معلوم ہوتی ہے۔ مدتوں تک اسے سڑک کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ہم لوگ اوپر چڑھے لیکن ہمارے ساتھ ناز و نعم میں پلی ہوئی جو خواتین تھیں وہ ان بلندیوں

مولانا کوثر نیازی اور وزیرِ اعظم چو این لائی سادہ پانی کے ساتھ جامِ صحت تجویز کیا جا رہا ہے

کوطے کرتے ہوتے ہانپ ہانپ گئیں۔ ناچار نیچے آئے، اُترتے ہوئے، دیوار کے کنارے شیشے کی مانند جمی ہوئی برف پر میرا پاؤں جو پھسلا تو میں گھٹنوں کے بل آ رہا۔ خاصی چوٹ آئی۔ یہ غنیمت ہے کہ چینی دوستوں نے لپک کر مجھے مزید قلابازیاں کھانے سے بچا لیا ورنہ ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔

مغرب کی جانب یہ دیوار ذرا خستہ حالت میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کے باوجود اسے دیکھ کر چین کی قدیم عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں پرانے زمانے کا ایک قلعہ بھی نظر آتا ہے جسے آج بھی فوجی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ یہاں سے آگے گوبی کا ریگستان پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ قلعہ کے بیرونی جانب پتھر پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے جس پر چینی زبان میں تحریر ہے —— "زمین پر سب سے بڑی رکاوٹ!"

دیوارِ چین سے تقریباً سات میل مشرق میں من ٹومبز کی مسافت آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک شہرِ خموشاں آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں من بادشاہوں کے تیرہ مقبرے ہیں جنھیں زیرِ زمین بنایا گیا ہے لیکن کھدائی کے بعد اب تک صرف تین مقبروں کا سراغ مل سکا ہے۔ یہ قبرستان پانچ محرابوں کے ایک بڑے دروازے سے شروع ہوتا ہے اور دور تک چلا گیا ہے۔ یہاں ہُو کا عالم طاری رہتا ہے۔ مقبرے ادھر اُدھر بکھرے ہُوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم نے جس شہنشاہ کا مقبرہ دیکھا وہ آج سے تین سو سال پہلے سربرآرائے سلطنت تھا۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں کئی سال کی کوششوں سے یہ مقبرہ تعمیر کروایا تھا کہ مروں تو اسی میں دفن کیا جاؤں۔ مقبرہ کیا ہے؟ تقریباً تین منزلیں زمین کے نیچے وسیع ہال اور بارہ دریاں ہیں۔ دیواروں میں عجیب خوب صورت پتھر لگا ہُوا ہے۔ یہ ہال چین کی سب سے بڑی عمارت ہے جو لمبائی میں ۷۰ گز اور چوڑائی میں ۳۰ گز واقع ہوا ہے چالیس ستونوں نے اس کی چھت کو سنبھال رکھا ہے۔ ہال میں ایک طرف ایک

سادہ میز پڑی ہے جس پر بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور ایک اسٹول ہے جس پر وہ تختی رکھی جاتی تھی جس پر مرنے والے کا نام کندہ ہوتا تھا اور جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مرنے والے کی روح اس میں سما گئی ہے۔ یہ سارا تماشا دیکھ کر خدا یاد آ گیا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

◉

سات بجے شام وزیرِ اعظم چو۔ این لائی کی طرف سے ضیافت تھی۔ ایک پُرشکوہ ہال میں اس کا انتظام کیا گیا تھا جس میں آسانی کے ساتھ دس ہزار افراد کی گنجائش موجود تھی۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی سب مہمان گروپ فوٹو کے لیے تیار تھے۔ سب نے چو۔ این لائی کے ساتھ تصویر کھچوائی۔

ضیافت کی میز پر مسٹر چو۔ این لائی کی نشست بیگم صاحبہ اور میرے درمیان تھی، اس طرح مجھے بہت قریب سے انھیں دیکھنے کا موقع مل گیا۔ چین میں اب تک جتنے لیڈروں سے میری ملاقات ہوئی تھی ان میں مسٹر چو این لائی کی شخصیت مجھے سب سے دل آویز نظر آئی۔ ستر سے زیادہ عمر ہو چکی ہے لیکن اب بھی جوانوں سے بڑھ کر چاق و چوبند ہیں۔

اس قدر متواضع واقع ہوئے ہیں کہ ہمہ وقت میرا سگریٹ جلاتے رہے، ہر کورس میں بہ اصرار میری پلیٹ میں کھانا ڈالتے رہے۔ ہمارے میز پر تقریباً بیس افراد ہوں گے، ہر ایک کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کیں، کھانا لانے والی لڑکیوں سے بے تکلفی کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے۔ طبیعت میں مزاح بہت ہے۔ ہال میں کھانے کے دوران پاکستانی اور چینی دھنیں بج رہی تھیں۔ ایک موقع پر جب پورے ہال میں میزوں سے پہلی پلیٹیں اٹھا کر نئی پلیٹیں سجائی جا رہی تھیں اور ان سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہو رہی تھی تو مسٹر چو۔ این لائی نے کہا:

"بیگم بھٹو کے اعزاز میں ہم نے یہ نئی موسیقی ایجاد کی ہے!"

ضیافت میں چین کی طرف سے وزیراعظم چو-این لائی نے تقریر کی جس کا جواب ہماری طرف سے خاتونِ اوّل بیگم نصرت بھٹو نے دیا۔ بیگم صاحبہ سے ملنے اور بات کرنے کے مواقع یوں تو پہلے بھی بہت ملتے رہے اور میں ان کی شرافت اور لیاقت کا دل سے قائل ہوں مگر مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ ایک دوسرے ملک کی ایک عالیشان تقریب میں جہاں چینی مشاہیر کے علاوہ بھارت سمیت سبھی ملکوں کے نمائندے موجود ہیں، اس پُراعتماد لب ولہجے کے ساتھ اتنی خوبصورت تقریر کریں گی۔ ان کی تقریر کے دوران ہال تالیوں سے بار بار گونج اٹھا اور سچ پوچھیے تو پاکستانی وفد کے اراکین کے سر فخر سے بلند ہوگئے۔

پاکستانی وفد وزیرِاعظم چو-این لائی کی دعوت میں شرکت کے لیے آرہا ہے

شنگھائی کے ایئرپورٹ پر پاکستانی وفد کا والہانہ استقبال
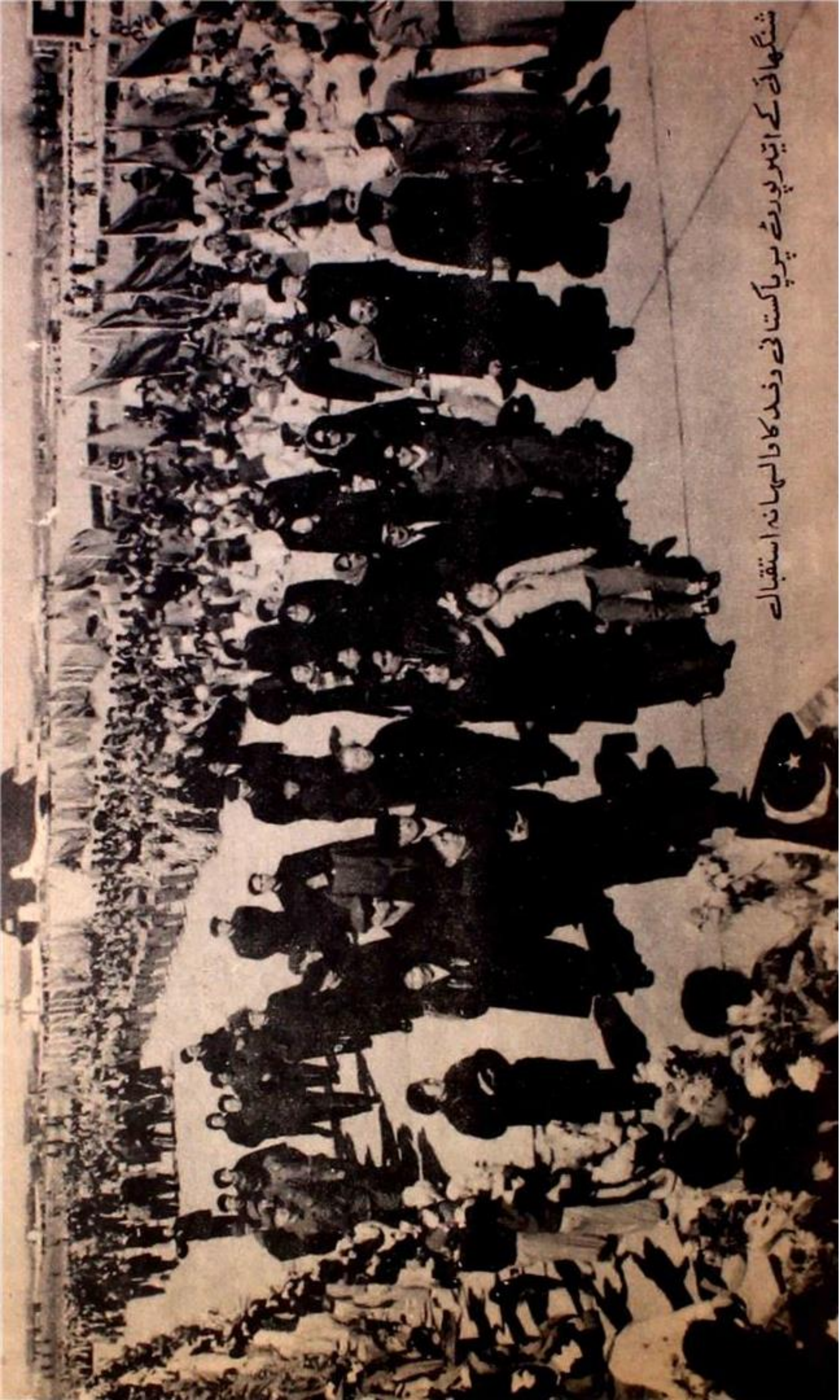
۲۰ فروری ۱۹۷۳ء

"چین کا سوشلسٹ نظام انسانیت کا مشترک ورثہ ہے
اور ہم اس سے بہت کچھ سیکھنے کے آرزومند ہیں"

◉

"شنگھائی شہر کے چینی زندہ
دلانِ لاہور کے بہت قریب ہیں"

◉

آج گیارہ بجے دن ہم شنگھائی روانہ ہوئے۔ بارش ہو رہی تھی۔ موسم صاف نہیں تھا لیکن چینی طیارے کی پرواز بڑی ہموار اور پُرلطف رہی۔ ہوائی اڈے پر برستی بوندوں میں بڑا پُرتپاک خیر مقدم ہوا۔ وہی رقص کرتے، گنگناتے، ہاتھوں میں بڑے بڑے پھول لیے صحت مند بچے اور بچیاں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہوائی اڈے پر رنگوں کی بارش ہو رہی ہے۔

خیر مقدم تو پیکنگ میں بھی زبردست ہوا تھا لیکن فرق یہ تھا کہ یہاں میلوں لمبے راستے پر بارش کے باوجود لوگ دو رویہ کھڑے نعروں اور تالیوں سے ہمارا استقبال کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے پیکنگ اور شنگھائی کا مزاج الگ الگ واقع ہوا ہے۔

شنگھائی کے عوام لاہور والوں کی طرح زندہ دل اور گرم جوش ہیں۔

کچھ اس بات کا بھی اثر ہے کہ پی۔ آئی۔ اے نے ۱۹۶۴ء میں جب پہلی مرتبہ چین کے لیے اپنی پرواز شروع کی تو شنگھائی ہی وہ شہر تھا جس کا براہِ راست پاکستان سے رابطہ قائم ہوا۔ اس لیے یہاں کے لوگ پاکستانیوں سے کافی مانوس ہیں۔
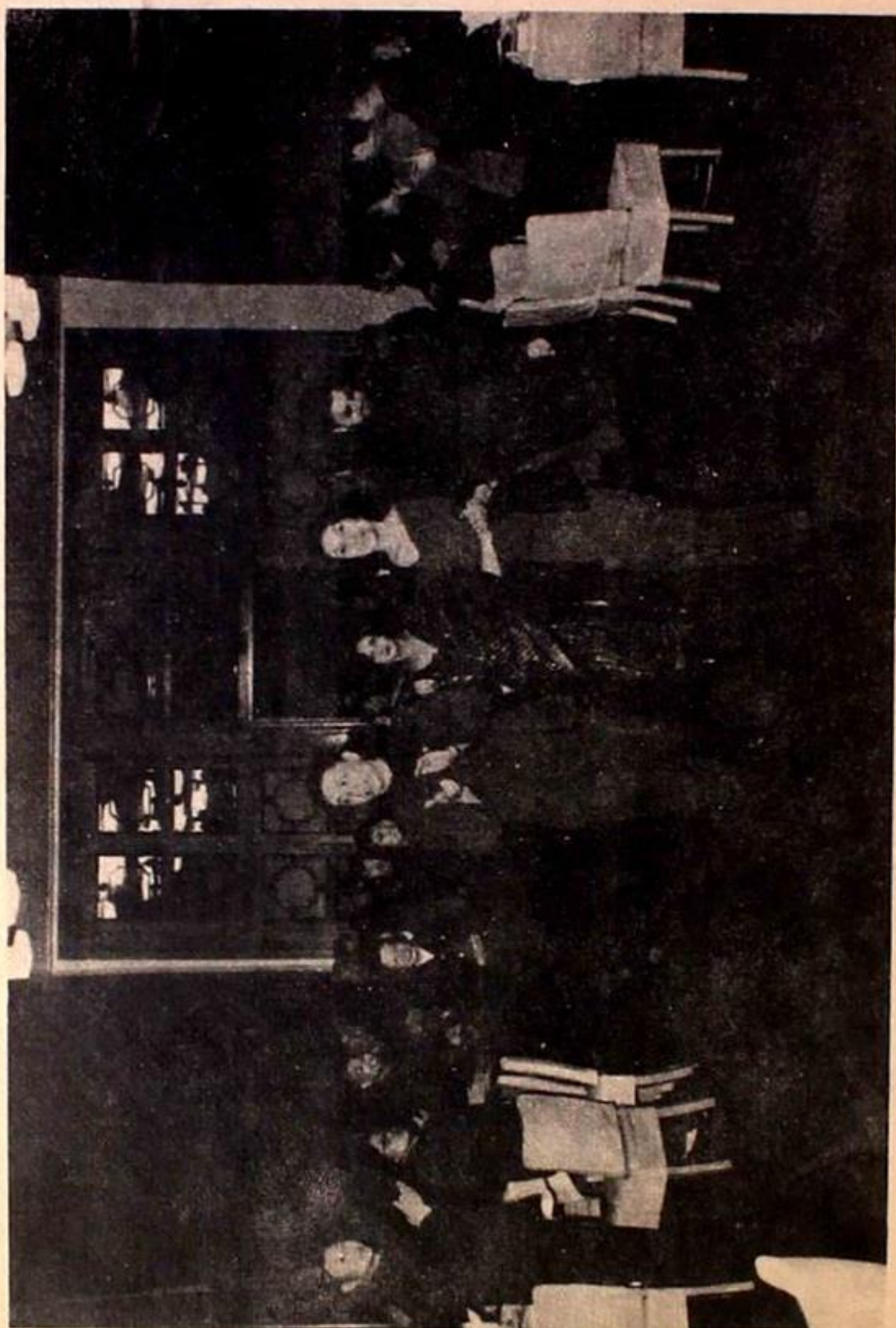
شنگھائی میونسپل کمیٹی میں پاکستانی وفد کا استقبال

شنگھائی چین کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے جو دریائے یانگ ٹسی کے دہانے پر واقع ہے۔ بندرگاہ ہونے کے علاوہ شنگھائی جدید طرز کا بہت بڑا شہر ہے جو ایک کروڑ کی آبادی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ شہر اب میونسپلٹی بنا دیا گیا ہے اور جو براہِ راست مرکزی حکومت کی نگرانی میں ہے اور جس کی حیثیت صوبے کی ہے۔ انقلابی کمیٹی یہاں کی کابینہ ہے جو سارے ریاستی اختیارات کی مالک ہے۔

تاریخی لحاظ سے شنگھائی کئی ایک عظمتوں کا امین ہے۔ یہیں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی، جس نے چند برسوں کے اندر ہی اندر چین میں ایک عظیم انقلاب بپا کر دیا۔ غلامی کا وہ ٹیکہ جو سالہا سال سے چین کی پیشانی کو داغ دار کر رہا تھا، وہ آخر ش ڈھل کے رہا اور اس کے ساتھ ہی بیرونی سامراج کے پروردہ طبقے کا اقتدار بھی ملیامیٹ ہو گیا۔ آج شنگھائی میں عوام کی حاکمیت کا پرچم لہرا رہا ہے۔

لنچ کے بعد اور دوست تو یوتھ پیلس دیکھنے چلے گئے، میں دل گرفتہ کمرے میں پڑا یادوں کی دھیمی دھیمی آنچوں میں سلگتا رہا۔

آج سڑکوں پر صحت مند بچوں کو دیکھ کر مجھے اپنا فاروقی یاد آتا رہا ہے

وہ نہیں بھولتا، جدھر جاؤں
ہائے میں کیا کروں، کدھر جاؤں

رات کو شنگھائی میونسپل کمیٹی کی طرف سے عشائیہ تھا۔ کمیٹی کے چیئرمین کی تقریر کا جواب بھی مجھے دینا تھا۔ سفارت خانہ نے حسبِ معمول ایک بے جان سا مسودہ تیار کر رکھا تھا۔ میں اردو میں اس کا ترجمہ کرتا چلا گیا۔ ترتیب یوں تھی کہ پہلے میں اردو بولتا، پھر انگریزی اور چینی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوتا۔ کمیٹی کے چیئرمین نے پاکستان کے لیے جن مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا تھا، ان کے پیشِ نظر مجھ سے

نہ رہا گیا۔ میں نے اپنے ترجمانوں کو جو پاکستانی سفارت خانہ سے تعلق رکھتے تھے، بتا دیا کہ میں چند کلمات فی البدیہہ بھی کہوں گا۔ ان کا ترجمہ ذرا خیال سے کرنا۔ لکھے ہوئے مسودے کے مطابق مکھی پر مکھی نہ مارتے چلے جانا۔ ایک اضافہ تو میں نے دورانِ تقریر یہ کیا کہ چین کے سوشلسٹ نظام کو میں نے انسانیت کا مشترکہ ورثہ قرار دیا۔ میں نے کہا:

"ہم لوگ ایک فراخ اور روشن نظریہ پر ایمان رکھتے ہیں، متعصب نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک آپ جو انقلاب لائے ہیں، وہ تاریخ کا ایک عظیم تجربہ ہے اور ہم اس سے بہت کچھ سیکھنے کے آرزومند ہیں۔"

دوسری بات پاک چین دوستی سے متعلق تھی۔ میں نے کہا:

"جناب چیئرمین! آپ نے اپنی تقریر میں پاکستان کے لیے جن دوستانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، ہم اس کے لیے ممنون ہیں اور جواباً آپ کو بھی یقین دلاتے ہیں کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے لیکن پاکستان اور چین کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔"

اس پر کافی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ ہمارے پاکستانی دوست بھی خوش تھے کہ آج ان کے جذبات کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔

کھانے کے بعد ایک ثقافتی تقریب منعقد ہوئی جو بحیثیت مجموعی خوب تھی۔
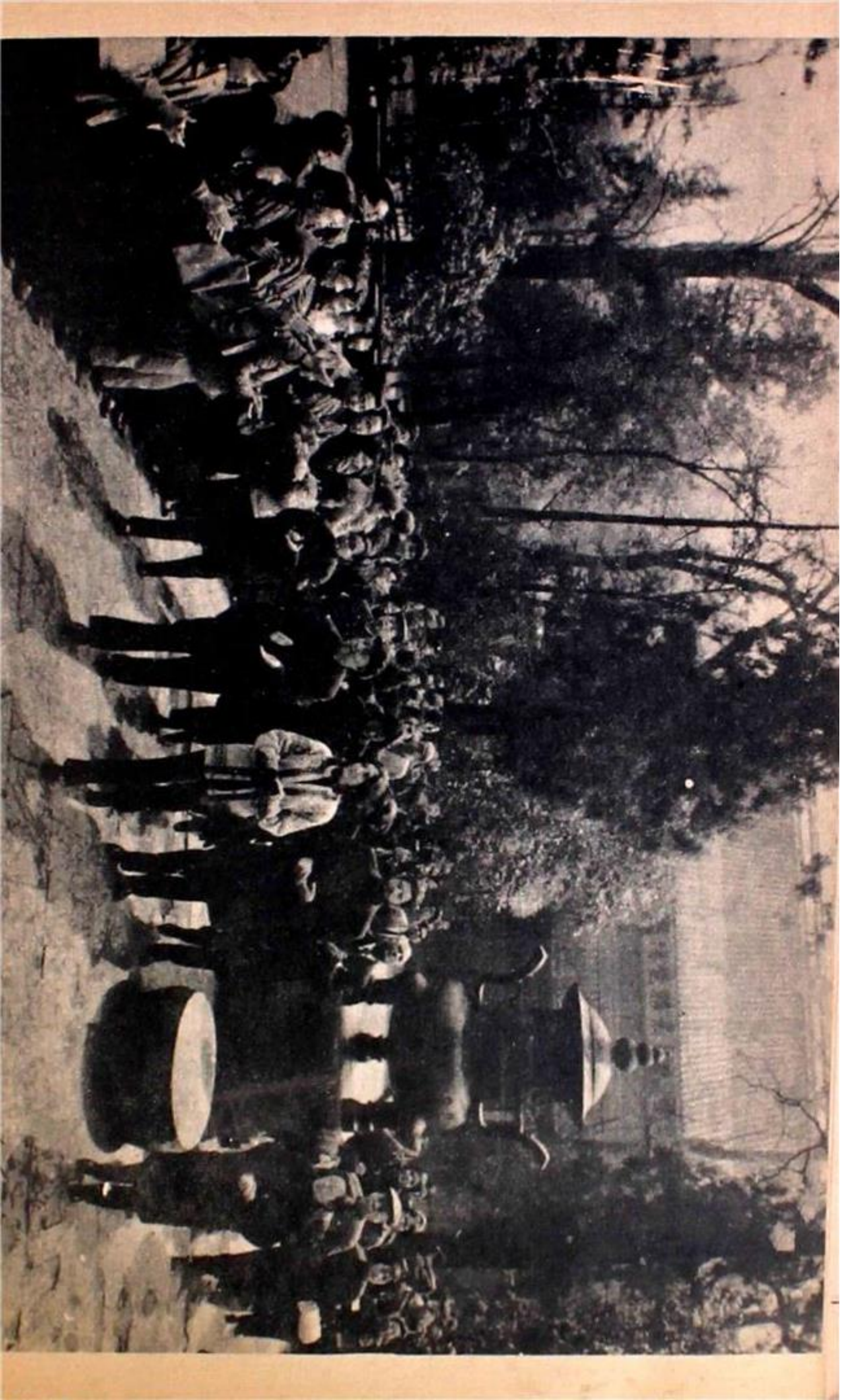
۲۱ فروری ۱۹۷۳ء

سب لوگوں کی خواہش تھی کہ سیر و تفریح تو اپنی جگہ خوب ہے مگر ایک آدھ کمیون بھی ضرور دیکھا جائے معلوم تو ہو یہ لوگ کیسے کام کرتے ہیں ؟ کمیون کس طرح عالم وجود میں آئے اور کن خطوط پر انھوں نے فروغ حاصل کیا ؟ ان سے کیا کیا فوائد حاصل ہوئے ؟ زراعت، صنعت، تجارت، تعلیم اور فوجی امور نے کس طرح ایک متحدہ قیادت میں اپنے آپ کو سمو لیا ہے ؟

یہ اور اس طرح کے دیگر سوالات ہمارے ذہنوں میں گردش کر رہے تھے اور ہم نے ارادہ کر لیا تھا کہ جب ہم یہاں آئے ہیں تو ان سوالات کے جواب ضرور حاصل کر کے رہیں گے۔

کل سے ہماری طرف سے یہ تقاضا ہو رہا تھا کہ کوئی کمیون ہمیں ضرور دکھایا جائے چنانچہ آج صبح جب یہ اطلاع ملی کہ نو بجے شہر سے باہر ہمیں کمیون دکھانے کے لیے ایک دیہاتی علاقے میں لے جایا جائے گا تو ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہم چاہتے تھے کہ چین کے اس ترقی یافتہ مثالی نظام کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اندازہ لگائیں کہ ہم اپنے ملک میں اس نظام کو کس حد تک اپنا سکتے ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک اجتماعی ترقی کے راستے پر گامزن ہو کر ہمارے عوام کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہو۔ عوام میں جذبۂ قیادت ابھرے، تعاون و پیش قدمی کا حوصلہ پیدا ہو۔ معیارِ زندگی کو بہتر سے بہتر بنایا جائے، حکومت اور عوام کے رابطے سے جمہوری اداروں کو فروغ حاصل ہو اور سماجی اور اخلاقی برائیاں ختم ہو کر ایک صالح اور باہمت معاشرہ وجود میں آجائے۔

پاکستانی وفد کے ارکان خاتونِ اوّل کی رہنمائی میں نقشے کی مدد سے ایک چینی کمیون کا جائزہ لے رہے ہیں

انہی خیالات کی ادھیڑ بن میں ہم نے "میکیاؤ پیپلز کمیون" دیکھا۔ یہ کمیون ستمبر ۱۹۵۸ء
میں قائم ہوا تھا۔ تقریباً چالیس ہزار کی آبادی پر مشتمل ہے۔ کمیون ہیڈ کوارٹر کے باہر بینڈ
باجوں سے ہمیں خوش آمدید کہا گیا۔ کمیون کے چیئرمین سے ملاقات ہوئی۔ اس نے نقشے کی
مدد سے اپنے کمیون کی ایک ایک بات بڑی تفصیل کے ساتھ ہمیں بتائی۔ کمیون کی
پیداوار اور وہاں کے باشندوں کی بنائی ہوئی مصنوعات بڑے قرینے سے سجا کر
رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں کوئی آٹھ ہزار گھرانے آباد ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں ہر گھرانے کو
نو سو یان (تقریباً ساڑھے چار ہزار روپیہ) کی آمدنی ہوئی تھی اور سال بہ سال زیادہ
محنت کرنے سے اس میں معتد بہ اضافے کا امکان موجود تھا۔ کمیون کے اپنے ہسپتال
اور اسکول ہیں۔ ہم نے یہاں ورکرز کے رہائشی مکانات بھی دیکھے جو رقبہ کے لحاظ
سے اتنے وسیع تو نہیں تھے لیکن بہت صاف اور ستھرے نظر آتے تھے۔ ایک
کارخانہ اور ہسپتال بھی دیکھا۔ کارخانے میں مزدور اپنے اپنے کاموں میں کھوئے
ہوئے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ ہر شخص اپنے فرائض کی بجا آوری
میں لگا ہوا تھا۔ ہسپتال کی عمارت بہت عمدہ اور صحت افزا مقام پر تعمیر کی گئی تھی۔

آسمان دو ہیں
ایک اوپر اور
دوسرا
ھانچاؤ میں

مرض کو جانچنے کے جدید آلات ہسپتال میں موجود تھے۔ ڈاکٹر اور نرسیں مریضوں کی خدمت پر مامور اور علاج معالجے کی ہر سہولت وہاں بہم پہنچائی جاتی تھی۔ سب سے حیرت افزا جو بات ہمیں نظر آئی وہ یہ تھی کہ وہاں زمین کے نیچے بھی کاشتکاری نظام پر عمل ہوتا تھا۔

سہ پہر کو بذریعہ طیارہ ہم ہانچاؤ روانہ ہوئے۔ یہ چین کا خوب صورت ترین شہر ہے اور چائے کے لیے مشہور ہے۔ سال کے بعض مہینوں میں یہاں کی ہوا چائے کی خوشبو سے معطر رہتی ہے یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب سبز چائے ہونان اور کیانگ سی کے صوبوں سے لاکر باہر بھجوانے کے لیے یہاں جمع کردی جاتی ہے۔ یہاں سرسبز پہاڑیاں ویسٹ لیک کے اردگرد عجیب بہار دکھاتی ہیں۔

"ویسٹ لیک" یہاں کی میلوں میں پھیلی ہوئی جھیل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ

جھیلوں کا ایک سلسلہ ہے۔ چین میں ایک کہاوت ہے کہ "آسمان دو ہیں ایک اوپر اور دوسرا ہانچاؤ میں"۔ اسی سے ویسٹ لیک کی وسعت اور رنگ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود سڑکوں پر ہزار ہا لوگ صف بستہ کھڑے تھے۔ میں نے اپنے ترجمان سے پوچھا:

"انہیں حکومت کی طرف سے لایا گیا ہے؟"

ہانچاؤ کے وائس چیئرمین بھی اس وقت میری گاڑی میں تھے۔ ترجمان نے ان سے پوچھ کر جواب دیا:

"نہیں! یہ از خود آتے ہیں"

"اخبارات اور ریڈیو سے پاکستانی وفد کی آمد کا اچھا خاصا چرچا ہو چکا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ آج آپ لوگ ہانچاؤ آرہے ہیں۔ پھر کسی خاص شخصیت کی آمد پر ہم لوگ ٹریفک روک دیا کرتے ہیں۔ اس طرح بھی عوام کو خبر ہو جاتی ہے کہ باہر سے کوئی بڑا مہمان تشریف لا رہا ہے۔ ویسے بھی پاکستان سے یہاں کے عوام کو بڑی محبت ہے؛ کیوں کہ چین اور پاکستان کے لوگوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ۱۹۴۹ء میں جب جمہوریہ چین کا وجود عمل میں آیا تھا تو پاکستان نے نہ صرف پڑوسی سمجھ کر ہمیں گلے سے لگایا، بلکہ اس وقت سے اب تک دونوں ملکوں کے عوام اخوت اور برادری کے ناقابلِ شکست رشتے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اسی لیے یہ آج ہجوم در ہجوم یہاں امڈ آتے ہیں۔"

ان محبت بھرے جذبات کے اظہار نے مجھ پر جو اثر کیا ہوگا، اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

سات بجے شام ہانچاؤ کی انقلابی میونسپل کمیٹی کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا۔ اس کے بعد چینی بچوں کی طرف سے ایک ثقافتی شو کا اہتمام تھا۔ یہ رنگا رنگ پروگرام دیکھ کر اندازہ ہوا کہ چین کی نئی نسل کتنی ہونہار ہے اور اس نسبت سے چین کا

مستقبل کتنا روشن ہے۔

چینی قوم نے اپنے بچوں کی ذہنی، جسمانی اور نظریاتی تربیت پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کی صحت اور تندرستی دیکھ کر رشک آتا تھا۔ توانا جسم، پھول سے چمکتے ہوئے گال، چہروں پہ موجِ تبسم کی دل آویزیاں ـــــ یوں معلوم ہوتا تھا کہ تندرستی پھوٹی پڑ رہی ہے۔ پھر ان بچوں کی حوصلہ مندی اور بے جھجک ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے خوشی محسوس کرنا خواہ مخواہ ہمیں متاثر کر رہا تھا اور ہمارے دلوں میں ان کی یادوں کے گہرے نقوش چھوڑتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بچے چینی قوم کا مستقبل ہیں اور ظاہر ہے جو قوم اس طریق پر اپنے بچوں کی تربیت کرتی ہے وہ ہمیشہ ایک درخشاں مستقبل کی حامل رہتی ہے۔

پاکستانی وفد بیگم بھٹو کی رہنمائی میں ویسٹ لیک کی سیر کر رہا ہے

۲۲ فروری ۱۹۷۳ء

ہم سب عظیم ماؤ سے ملنے کے خواہشمند تھے
مگر معلوم ہوا کہ یہ ہمارے پروگرام میں
شامل نہیں!

آج صبح ویسٹ لیک کی سیر کا پروگرام تھا۔ ایک شاندار لانچ میں قرینے سے نشستیں سجی ہوئی تھیں۔ چینی قہوہ، پھل، مٹھائی اور سگرٹ کا وافر انتظام تھا۔ ایک دوسری لانچ پی۔آئی۔اے کے مہمانوں کے لیے تھی۔

ہمارے سندھی دوست قاضی محمد بخش بہت زندہ دل آدمی واقع ہوئے ہیں۔ لانچ کے باہر کے حصے پر آکر "جو جمالو" کی دھن پر رقص کرنے لگے۔

پی۔پی۔پی کے امان اللہ خان اور صاحبزادہ فاروق علی کیوں کسی سے پیچھے رہتے۔ دونوں تالیاں بجانے لگے۔ اب صورت یہ ہوگئی کہ پاکستانی چیئرمین ماؤ کے نعرے لگا رہے تھے اور اس کے جواب میں دوسری طرف سے چینی چیئرمین بھٹو کے نعرے لگاتے تھے۔ پورا تفریحی سفر اسی انداز میں ختم ہوا۔

جھیل کے بعد ایک قدیم تاریخی معبد دیکھنے چلے گئے۔ یہ عبادت گاہ کوئی ایک ہزار سال پرانی ہے۔ ایک زمانے میں چین بعض مشرکانہ مذاہب کا اچھا خاصا گڑھ بنا رہا ہے۔ اس کے زیر اثر چینی عوام برس ہا برس تک بت پرستی اور توہمات میں مبتلا رہے ہیں۔ ماؤزے تنگ نے اپنے افکار میں اسی رائج الوقت مذہب کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ایسے مذاہب کے خلاف چینی مفکر کے نظریات کو اسلام کی مخالفت قرار دینا

غلط ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ ماؤزے تنگ پر اگر روحِ اسلام منکشف ہو جائے تو وہ
اسے مذہب سمجھ کر نہیں، ایک مثالی نظامِ حیات سمجھ کر فوراً ایمان لے آئے گا۔

ہم سب عظیم ماؤ سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ ہمارے پروگرام
میں شامل نہیں۔ یوں بھی اب ماؤ عمر کے اس حصے میں ہیں کہ وفود سے کم ہی ملتے
ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی سالگرہ منائی گئی تھی لیکن اس کے لیے بھی خاص تزک و احتشام
نہیں ہوا، حالانکہ دنیا کے بڑے بڑے لیڈروں کے ناموں اور ان کے حالاتِ زندگی
کی ایسے مواقع پر بڑی اشاعت کی جاتی ہے اور کئی دنوں تک اس کا غلغلہ بلند رہتا ہے
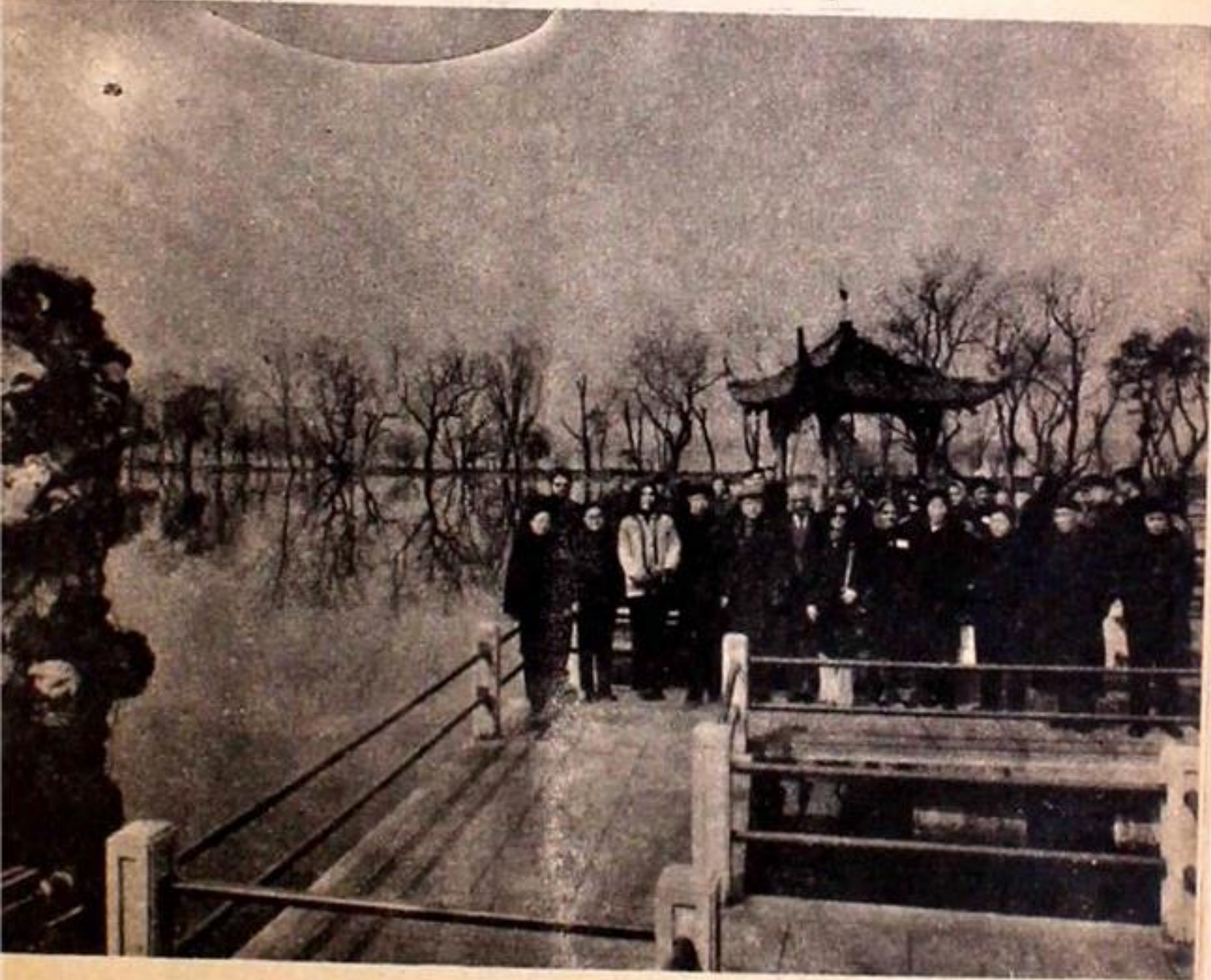
ویسٹ لیک کا ایک خوبصورت منظر

یہی نہیں بلکہ ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی خوب پھیلایا جاتا ہے۔ مثلاً امریکی صدر بیمار ہوئے اور انھیں آپریشن کروانا پڑا تو پبلک کو ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے ان کے زخم کے داغ تک دکھائے گئے لیکن چینی لیڈر عام طور پر اس وقت سے جبکہ انھوں نے چیانگ کائی شیک کی حکومت کے خلاف گوریلا جنگ شروع کی تھی، اپنی شخصیت کی تشہیر سے پرہیز کرتے رہے ہیں۔ صرف ماؤ ہی اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ وہ چینی عوام کے لیے مرکزی نقطۂ قیادت ہیں۔ مگر ان کی روزمرہ زندگی کے حالات بھی بڑی حد تک دنیا کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

مجھے اپنے ترجمان اور پاکستانی سفارت کے بعض ارکان سے معلوم ہوا کہ ماؤ اور چند دوسرے چوٹی کے چینی لیڈر ایک مخصوص رقبے میں اقامت گزین ہیں جو پیکنگ سے ۲۵ میل شمال مغرب کی جانب واقع ہے اور جسے نیو پیکنگ کہا جاتا ہے۔ اس علاقے میں صرف بہت بڑے سینیئر سرکاری افسر ہی جا سکتے ہیں یا پھر حفاظتی دستے کے چند سو نہایت ہی قابل اعتماد افراد کو وہاں جانے کی اجازت ہے۔

ساڑھے آٹھ مربع میل کا یہ علاقہ درختوں کے گھنے جھنڈ میں اچھی طرح لپٹا ہوا ہے۔ اس کے اردگرد ساٹھ فٹ چوڑائی میں درخت لگائے گئے ہیں۔ جن کی حفاظت کے لیے ہوائی حملوں سے بچاؤ کی توپیں مناسب موقعوں پر نصب ہیں۔ حفاظتی گارڈ ۵۰۰ افراد پر مشتمل ہے اور وہ سب کے سب چینی فوج کے سابق کمپنی کمانڈر یا پلاٹون لیڈر ہیں۔ اندرونی حفاظتی انتظامات کی یہ کیفیت ہے کہ ہر تین سو فٹ کے فاصلے پر چوبیس گھنٹے سنتری پہرہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اندر آنے والوں کو صدر دروازے پر دو مرتبہ شناخت کیا جاتا ہے۔ گیٹ پر سادہ سے الفاظ لکڑی کے ایک تختے پر لکھے ہوئے ہیں —— "بند علاقہ" کسی ملاقاتی کو اندر آنے کی اجازت نہیں یہاں تک کہ کابینہ کے وزیروں کو بھی داخلے کے پاس رکھنے پڑتے ہیں۔ حفاظتی گارڈ میں شمولیت

کے وقت اس قدر احتیاط کی جاتی ہے کہ جو کمیونسٹ ورکرز کسانوں میں کام کرتے رہے ہیں اور پھر جنگ میں انھوں نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں صرف انہی کو پیکنگ کی گارڈ میں شامل کیا جاتا ہے۔ خود ماؤ کا ذاتی محافظ ۱۹۳۰ء کے مشہور طویل مارچ کا سرکردہ افسر ہے۔

ماؤ کا رہائشی مکان "ایچ" شکل کا بنا ہوا ہے۔ سرخ اور بھورے رنگ کی اینٹوں سے اُسے تیار کیا گیا ہے۔ اس کے ایک طرف پانچ رہائشی کمرے ہیں جن میں ایک بڑا کمرہ تو استقبالیہ کے طور پر استعمال میں آتا ہے۔ ایک کھانے اور ایک مطالعہ کے لیے وقف ہے اور دو خواب گاہ کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک تو ماؤ کی اپنی خواب گاہ اور دوسرا ان کی بیگم کے سونے کے لیے ہے۔ ان کمروں کے دوسری جانب چار سیکریٹریوں کی رہائش ہے۔ وہاں ایک فائلوں کا کمرہ، چند ایک انتظار کے کمرے اور ماؤ کا اپنا ذاتی دفتر بھی یہیں ہے۔

ماؤ کا پسندیدہ کمرہ ان کے مطالعہ کا کمرہ ہے جہاں دس ہزار کتابوں پر مشتمل ایک لائبریری ہے۔ یہاں وہ اکیلے پہروں تک بیٹھے مطالعہ میں مصروف اور شعر گوئی میں منہمک رہتے ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں لیکن مشہور ہے کہ جب کسی شعر میں اپنی پسند کا کوئی لفظ یا محاورہ موزوں کرنے میں کچھ دقت محسوس کرتے ہیں تو جھنجلاہٹ میں زور زور سے میز پر ہاتھ مارتے ہیں۔

ماؤ کی چوتھی بیوی چیانگ چنگ جو ایک سابقہ فلم ایکٹرس اور اب پراپیگنڈا ڈیپارٹمنٹ کے فلم سیکشن کی انچارج ہے، اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ ماؤ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ان میں سے بڑا لڑکا منچوریا کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ دوسرا لڑکا پیکنگ میں روسی زبان کا استاد ہے۔

ماؤ بالعموم دوپہر تک سوتے ہیں۔ سہ پہر کو بہت کم لوگوں سے ملاقات کرتے

ہیں۔ البتہ جب تندرست اور صحت مند ہوں تو اکثر رات کے وقت چوٹی کے کمیونسٹ رہنماؤں سے صلاح مشورے میں مصروف رہتے ہیں۔

دن بھر میں وہ پانچ مرتبہ ہلکی خوراک کھاتے ہیں۔ بار بار چائے نوشی ان کا معمول بن گیا ہے۔ ریڈ سٹار کے تقریباً پچاس سگرٹ پھونک ڈالتے ہیں۔ رات کو ایک دو بجے کے قریب سوتے ہیں۔ کھانا بالعموم اکیلے ہی نوش کرتے ہیں۔ طبیعت چاہے تو کبھی کبھی کسی شاعر یا پارٹی کے لیڈر کو کھانے پر مدعو کر لیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ رات کے کھانے کے بعد اپنے طویل مارچ کے رفقاء کے ساتھ شطرنج کھیل کر بھی دل بہلا لیتے ہیں۔ اپنی تنہا پسند طبیعت کے باعث وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں سے بھی بہت کم بات کرتے ہیں۔

دنیا کے دوسرے سیاسی رہنماؤں کے مقابلے میں ماؤزے تنگ کی زندگی بہت سادہ ہے۔ مثلاً وہ ہاتھ سے بنی ہوئی سوتی جرابیں پہنتے ہیں۔ سادگی ان کی طبیعت کا حصہ بن چکا ہے۔ آج سے تیس برس پیشتر جب وہ انقلابیوں کے ایک گروپ کے لیڈر تھے تو شمال مغربی چین کے ایک پہاڑی غار میں اقامت گزیں رہے جس کے اندر دو کمرے بنا لیے گئے تھے۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ:

"اُن کی املاک میں عیاشی کا سامان صرف ایک مچھر دانی ہے۔"

یہ ہیں مختصر حالات سرخ چین کے سب سے بڑے انقلابی لیڈر کے جن کی کوششوں سے چین آج ایسی پوزیشن میں ہے کہ مغربی و مشرقی بلاک کے بڑے بڑے ممالک اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ ہو رہے ہیں۔

ماؤزے تنگ کی انقلابی جدوجہد ابھی امتحان اور آزمائش کے مرحلے میں تھی کہ ہمارے قومی شاعر اور حکیم مشرق علامہ اقبال نے اسے دیکھا اور دیکھ کر یہ پیشگوئی

کردی ہے

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا

تماشا دکھا کر مداری گیا

رات کو چین کی نیشنل ایئر لائنز کی خصوصی پرواز کے ذریعے پیکنگ روانگی ہوئی۔ ہوائی اڈے پر نائب وزیر اعظم اور دوسرے اکابر موجود تھے۔ یہاں تھوڑی دیر کے لیے وی۔ آئی۔ پی لاؤنج میں آرام لیا۔

رات کو گیارہ بجے اسلام آباد کو واپسی تھی۔

آج بلا کی سردی تھی۔ ہلکی ہلکی برف باری بھی ہو رہی تھی۔ ہوائی اڈہ شہر سے کئی میل دور ہے۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ آج کی الوداعی تقریب ایک خاموش تقریب ہوگی۔ لیکن وی۔ آئی۔ پی لاؤنج سے جو باہر نکلے تو یوں معلوم ہوا جیسے کسی دوسری دنیا میں آگئے ہیں۔

وہی ——— بچوں اور پھولوں سے ترتیب دیا ہوا، ایک خوب صورت، مسکراتا، رقص کرتا گلشن سا کھلا ہوا ہمارے سامنے تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی بینڈ نغمے بکھیرنے لگا۔ چینی زبان میں خیر مقدم کے ترانے بلند ہوئے۔ ہجوم اتنا تھا کہ ہوائی اڈے کی وسعت تنگ نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف چین اور پاکستان کے پرچم لہرا رہے تھے۔ ان دلنشین مناظر کو چھوڑ کر ہم لوگ ہاتھ ملاتے، ہاتھ ہلاتے اپنے طیارے میں داخل ہو گئے۔
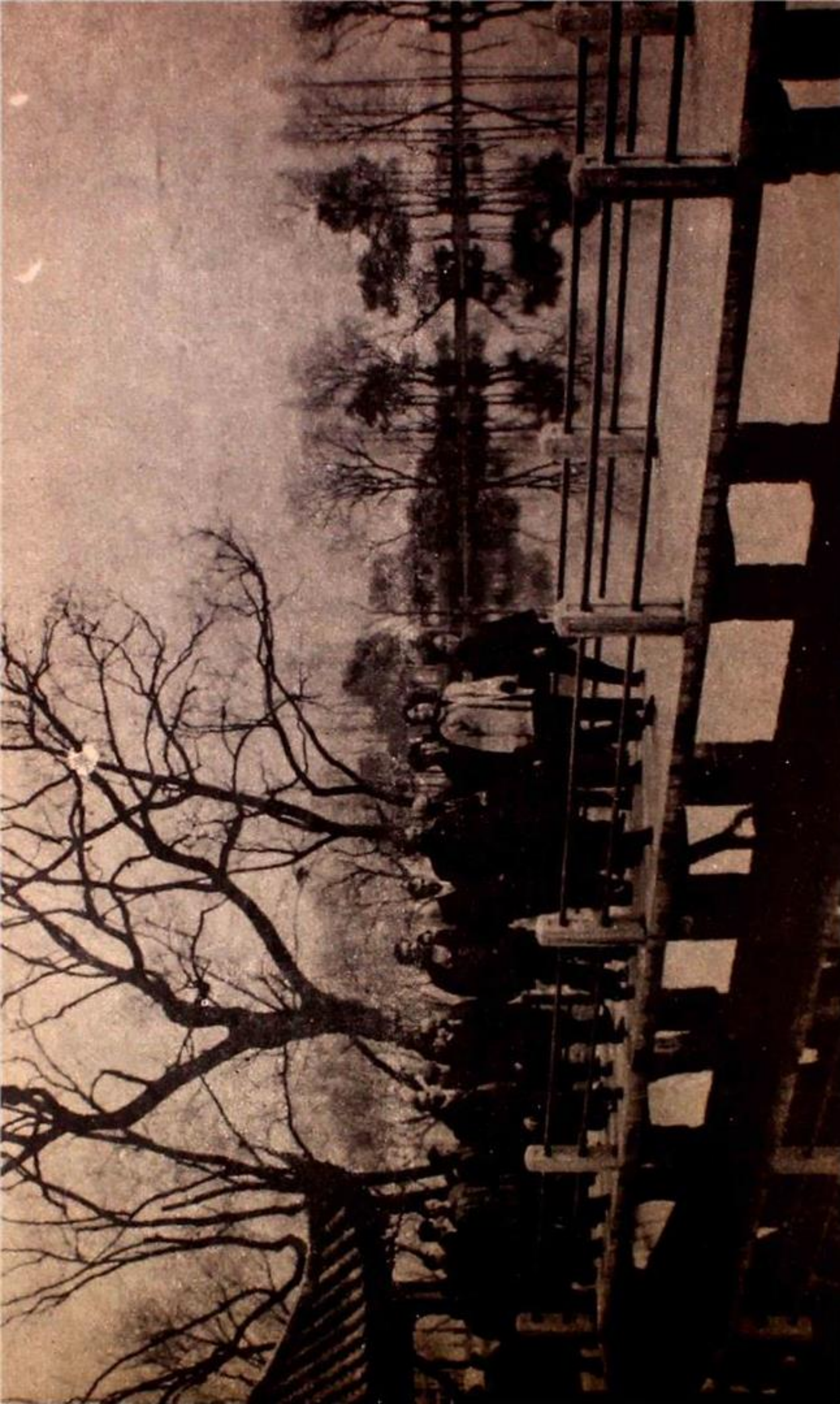
۲۳ فروری ۱۹۷۳ء

"انقلاب کے بعد چین میں انسانی گوشت کی منڈیوں کی جگہ ایک صالح معاشرہ قائم ہو چکا ہے"

طیارہ فضا میں بلند ہوا تو گذشتہ ہفتہ کے واقعات فلم بن کر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔

چینی قیادت کی اولوالعزمی، عوام کی سخت کوشی، نظم و ضبط، اخوت و مساوات کے مظاہرے، قابلِ رشک جسمانی و اخلاقی صحت، مستقبل کی ہونہار نژادِ نو، غرض کہ میرے مشاہدے کا ایک ایک پہلو مجھے دعوتِ فکر دے رہا تھا۔

اسلام میں لا اور اِلّا نفی اور ثبات کے دو مرحلے ہیں اور دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

لا کے مقام پر فائز ہوئے بغیر اِلّا کی منزل نصیب نہیں ہوتی۔ ایک خدا کو ماننے سے پہلے کتنے ہی جھوٹے خداؤں سے بغاوت کرنی پڑتی ہے۔ نفسانیت، برادری، نسل، رنگ، جغرافیائی حدود، سرمایہ داری، ملوکیت، مُلّائیت، برہمنیت اور پاپائیت ان سب بتوں کو چکنا چور کرنا پڑتا ہے —— اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چین والے لا کے ان تقاضوں کا حق ادا کر چکے ہیں۔ اب اِلّا کا درجہ باقی رہ گیا ہے۔ کیا عجب کہ رب العالمین کسی دن چینیوں کے ضمیر پر اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دے اور یہیں سے عقیدہ و عمل کا وہ انقلاب پوری دنیا میں پھیل جائے جو کائنات کا مقدر

بن چکا ہے۔

ستمبر ۱۹۷۰ء میں یحییٰ خان کی عنایات کے طفیل مجھے پانچ سال قید بامشقت کی سزا ملی تو میں نے گھر سے قرآنِ حکیم کے علاوہ ماؤزے تنگ کے سیلیکٹڈ ورکس بھی منگا لیے تھے۔ صبح نماز کے بعد میں قرآنِ حکیم کی تدبّر و تفکّر کے ساتھ تلاوت کرنے کے بعد ماؤ کے افکار کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس ضمن میں اگر میں یہ کہنے کی جسارت کروں تو ممکن ہے کچھ لوگ اسے میری شوخ چشمی قرار دیتے ہوئے مجھ پر کفر کا فتوٰی لگانے سے بھی گریز نہ کریں، لیکن یہ میرے دل کی آواز ہے اور میں اسے کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے چھپانا جرمِ عظیم سمجھتا ہوں کہ ماؤزے تنگ کی تحریروں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآنی فکر کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ بہت سے مقامات پر تو اس وقت میں نے حاشیے میں قرآنِ حکیم کی متعلقہ آیات بھی لکھ ڈالی تھیں۔

ماؤزے تنگ کی تعلیمات کا ایک اہم نکتہ پارٹی اور معاشرے کو تضادات سے پاک کرنا ہے۔ وہ جگہ جگہ اس پر زور دیتے ہیں۔ ۲۷ فروری ۱۹۵۷ء کو ایک تقریر کے دوران کامریڈ ماؤزے تنگ نے کہا تھا:

"مارکسی فلسفہ کے مطابق وحدتِ اضداد کا قانون کائنات کا بنیادی قانون ہے۔ یہ قانون ہر جگہ کار فرما ہوتا ہے۔ خواہ وہ عالمِ فطرت ہو، انسانی معاشرہ ہو یا انسانی فکر ہو کسی تضاد میں اضداد کے درمیان بیک وقت وحدت بھی ہوتی ہے اور کشمکش بھی اور یہی چیز ہے جو اشیا کو حرکت اور تبدیلی کی طرف بڑھاتی ہے۔ تضادات ہر جگہ پائے جاتے ہیں لیکن ان کی نوعیت میں مختلف چیزوں کی مختلف نوعیتوں کے مطابق فرق ہوتا ہے۔ کسی مخصوص مظہر یا شے میں وحدتِ اضداد مشروط، عارضی اور عبوری ہوتی ہے۔ اور اس بناء پر اضافی

پارچات پر دستکاری کا کام پاکستانی وفد کی خاص توجہ کا مرکز بنا

ہوتی ہے درآنحالیکہ اضداد کے درمیان کشمکش مطلق ہوتی ہے۔

عوام کے مابین تضادات حل کرنے کے جمہوری طریقے کا ۱۹۴۲ء میں "اتحاد، تنقید، اتحاد" کے فارمولے کی صورت میں خلاصہ کیا گیا تھا۔ اس کا بالوضاحت مطلب یہ ہے کہ اتحاد کی خواہش کے تحت ابتدا کی جائے۔ تنقید یا جدوجہد کے ذریعے تضادات حل کیے جائیں اور ایک نئی بنیاد پر نیا اتحاد قائم کیا جائے۔ ہمارا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ عوام کے مابین تضادات حل کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے ۱۹۴۲ء کی اصلاحی تحریک کے دوران یہی طریقہ استعمال کیا گیا۔ اس طرح چند ہی سال کے بعد یعنی ۱۹۴۵ء میں جب چین کی کمیونسٹ پارٹی کی ساتویں قومی کانگرس منعقد ہوئی تو پوری پارٹی میں اتحاد قائم ہو گیا اور نتیجتاً عوامی انقلاب کی عظیم فتح حاصل کی گئی۔ ضروری بات یہ ہے کہ ابتدا اتحاد کی خواہش کے تحت کی جائے۔ اس لیے کہ موضوعی طور پر اتحاد کی اس خواہش کے بغیر جدوجہد یقیناً قابو سے باہر ہو جائے گی کیا یہ بات "بے رحم جدوجہد اور سنگدلانہ ضربوں" کے برابر نہیں ہوگی؟

چین میں سیر کا ایک اور منظر

اور پارٹی میں کونسا اتحاد باقی رہے گا؟ اسی تجربے کی بنا پر "اتحاد، تنقید، اتحاد" کے فارمولے تک پہنچے۔ یا بہ الفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ "ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھو تاکہ آیندہ ان کا ارتکاب نہ ہو اور بیماری کا علاج کرو تاکہ بیمار کو بچایا جا سکے"

قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ قرآنِ پاک نے کائنات کو جس طرح دیکھا اور دکھایا ہے، اس میں بھی اسی پہلو کو بطورِ خاص نمایاں کیا گیا ہے۔ قرآنِ حکیم کے نزدیک یہ نظامِ کائنات بھی خامیوں، غلطیوں اور تضادات سے پاک ہے۔ وہ علی الاعلان کہتا ہے:

مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ﴿۳﴾

تو خدائے رحمان کی پیدائش میں کوئی بے ضابطگی نہ دیکھے گا۔
پھر تو نظر کو لوٹا، کیا تو اس میں کوئی شگاف دیکھتا ہے۔

یہ قرآنی ارشاد ہی تو ہے کہ اس خدائی سسٹم میں تمہیں کہیں بھی تضاد نظر نہیں

آئے گا۔ وہ توحید کی دعوت دیتا ہے۔

اس وقت خیالات کا یہ ہجوم ہوا تو جی میں آیا کہ کبھی غمِ زمانہ فرصت دے تو اپنے عہدِ اسیری کا یہ حاصلِ مطالعہ بھی شرح و بسط کے ساتھ قلم بند کر دوں۔

میں نے خود بھی دیکھا اور چین میں مقیم پاکستانی دوستوں سے بھی معلوم ہوا کہ چین میں کج روی تو ایک طرف رہی، نگاہوں کی آوارگی تک ناپید ہے۔ مرد عورت سبھی محنت کش ہیں۔ اپنا کام کل پر چھوڑنے کے عادی نہیں بلکہ وقت سے بہت پہلے مکمل کر لیتے ہیں اور جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں اسے منصوبہ بندی کے تحت نہایت انہماک سے پورا کر کے دم لیتے ہیں۔ دوسرے ان کا لباس اتنا ستر پوش اور حیا بردوش ہے کہ اس کے بعد کسی تیسرے درجہ میں پہنچے ہوئے جنسی مریض ہی کو ہوس ناکی سوجھ سکتی ہے۔ جسم فروشی قانوناً ممنوع ہے۔ چین کے طول و عرض میں جہاں موجودہ عوامی عہد سے پہلے قدم قدم پر انسانی گوشت کی منڈیاں لگتی تھیں۔ اس وقت ایک بھی چکلہ نہیں ہے۔

لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ خیالات کی سادگی، لباس کی سادگی اور طرزِ تمدن میں سادگی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ابتدا ہی سے بچوں کو سادگی، نظم و ضبط اور حسنِ اخلاق کی تربیت دی جاتی ہے۔ حب الوطنی کا جذبہ عام ہے۔ نوجوان چینی محبانِ وطن نے عوام کو تعلیم دینے میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اور ملک و قوم کی بے بہا خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے حکومت کے اس اعلان کے جواب میں برضا و رغبت اپنی خدمات پیش کیں کہ:

"جاہل انسان اندھوں کی طرح ہوتا ہے کیا آپ چین کے تین چوتھائی آبادی کو اندھا دیکھ سکتے ہیں؟"

کالجوں اور سکولوں کے طلبار تعلیم پھیلانے کے لیے ملک بھر میں پھیل گئے۔ تعلیمِ بالغاں کا اجرا ہوا۔ دیہاتوں میں نئے نئے سکول کھل گئے۔ لڑکیوں نے بھی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اور انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج پورے چین میں کوئی مرد اور عورت ایسا نہیں جسے ان پڑھ اور جاہل کہا جا سکے۔

انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے سرکارِ ختمی مرتبت کا وہ ارشادِ گرامی یاد آیا۔ جسے سن کر ہمارے ہاں کے بعض مولوی صاحبان کو سخت تکلیف ہوتی ہے:

اطلبوا العلم ولو کان بالصّین

علم حاصل کرو خواہ چین ہی کیوں نہ جانا پڑے

مولوی صاحبان کا ارشاد ہے کہ یہ حدیث غلط اور وضعی ہے۔ مگر کیوں؟

اس لیے کہ اس میں "چین" کا لفظ ہے جسے سن کر خواہ مخواہ کچھ لوگ "چیں" بول جاتے ہیں!

کیا دوسری متعدد احادیث سے طلبِ علم کی اہمیت پر روشنی نہیں پڑتی؟

وہ لوگ جو ایک "مزاج شناس رسول" کو حق دیتے ہیں کہ وہ چاہے تو مضمون پر نظر کرتے ہوئے "صحیح" حدیث کو رد کر دے اور چاہے تو ایک ضعیف حدیث کو قبول کرے، وہ اس کے مضمون کو درایت کی بنیاد پر کیوں نہیں پرکھتے؟

خیر! یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ اس ارشاد کی روشنی میں، چین سے واپسی پر میں یہ برابر سوچ رہا تھا کہ وہ کون سا علم تھا جس کی طلب کے ضمن میں چین کا حوالا دیا گیا ہے۔

اگر اس سے دینی علوم مراد لیے جائیں تو ان کا مرکز تو مدینۃ الرسول تھا۔ اس کے لیے باہر جانے کی کیا ضرورت تھی؟

البتہ سائنسی علوم کے لحاظ سے چین اس زمانے میں ضرور ممتاز و منفرد تھا۔

مقناطیس وہاں ایجاد ہو چکا تھا۔ جنگلی پودوں کے ریشے سے کاغذ بنا لیا گیا تھا۔ پریس کی ایجاد سے کتابیں چھپنا شروع ہو گئی تھیں۔ ریشم کے کپڑے کا رواج بھی ہو گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اہلِ چین ان ایجادات کو ترقی نہ دے سکے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان ایجادات کا سہرا چینیوں کے سر ہے۔ اہلِ مغرب نے بہت کچھ ان سے سیکھا اور سائنسی ایجادات کو ترقی دے کر وہ شکل عطا کر دی جو ہمارے سامنے ہے۔ چینیوں کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے صرف ان ایجادات کو معراجِ ترقی تک پہنچایا جن میں لگاتار محنت، استقلال اور دستکارانہ مہارت کی ضرورت تھی —— لیکن آج تو وہ ایک تیسری زبردست طاقت بن کر ابھر آیا ہے۔ اس حوالے سے حدیث نبوی کا حوالہ کچھ اور بھی معنی آفرین ہو جاتا ہے۔

آج کے چین نے ماؤزے تنگ کی قیادت میں جو انقلاب برپا کیا ہے، اس کا علم بذاتِ خود ایک بڑی دولت ہے اور اس کے حصول میں کوتاہی کسی علم دوست انسان کو نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ چین کل کیا تھا اور آج کیا ہے؟ کیا ہم بھی اسی طرح اپنے سحر و شام نہیں بدل سکتے؟ میں نے اپنی قوم کے فلاکت زدہ ماحول کو دیکھا اور پھر مجھے چیئرمین ماؤ کے وہ کلمات یاد آئے کہ:

" ماضی!

جیسے کوئی بھولا بسرا دھندلا سپنا

جس کی یاد کے ساتھ دل میں نفرت کا جذبہ اُبھر آئے!

دکھی انسان اُٹھے،

ہاتھوں میں سرخ پھریرے

قربانی کے سچے جذبے سے سرشار

تند ارادے !

نئے عزائم !!

اس دھرتی پہ چمکنے والے

انوکھے چاند، انوکھے سورج !!!

دھان کے کھیت اور گیہوں کے کھلیان ،

خوشیاں ، موج بہ موج

آج مرا جی کتنا خوش ہے !

شام کی نیلی پیلی دھند میں
اپنے گھروں کو پلٹنے والے ـــــ لوگ جیالے ،
اُن کے چہرے دیکھ کے آج مرا جی کتنا خوش ہے !"

بیگم نصرت بھٹو اور مولانا کوثر نیازی چینی میزبانوں کے ساتھ

اس رات خدا جانے میں اور کیا کیا سوچتا کہ اچانک ایئر ہوسٹس کی آواز آئی ـــــ

" خاتونِ اوّل ،

خواتین و حضرات !

ابھی تھوڑی دیر میں ہم اسلام آباد کے ایئر پورٹ

پر اترنے والے ہیں ۔

براہِ کرم آپ اپنے حفاظتی بند باندھ

اور

نشستیں سیدھی کر لیجئے ، !

شکریہ !"

مولانا کوثر نیازی ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ء کو پیدا ہوئے۔ وہ ابھی نوعمر طالبعلم ہی تھے کہ انہوں نے عملی سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا اور کچھ عرصہ تک مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو، عربی اور فارسی میں آنرز کیا۔ زمانہ طالب علمی کے فوراً بعد وہ صحافت سے وابستہ ہوگئے اور لاہور سے شائع ہونیوالے روزنامہ "تسنیم" اور "کوثر" کے مدیر رہے۔ انہوں نے ۱۹۶۰ء میں "شہاب" جاری کیا جو عوامی جدوجہد کے زمانے میں پاکستان میں سب سے زیادہ تعداد میں شائع ہونے والا ہفت روزہ تھا۔

۱۹۷۰ء میں پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے اور انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کا سیکرٹری اطلاعات مقرر کیا گیا۔

یحییٰ خان کے دور حکومت میں مارشل لاء عدالت نے انہیں ان کی تقاریر اور تحریروں کی بنا پر پانچ سال کی سزا دی لیکن اسی سال دسمبر میں جبکہ ابھی وہ پابند سلاسل ہی تھے، وہ ایک لاکھ ووٹ حاصل کرکے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ان کے سات حریفوں کی ضمانتیں بھی ضبط ہوگئیں۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو مولانا کوثر نیازی کو ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو صدر کا مشیر برائے اطلاعات و نشریات، اوقاف و حج مقرر کیا گیا اور ۶ مارچ ۱۹۷۲ء کو انہیں اطلاعات و نشریات کا وزیر مقرر کیا گیا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو وہ پاکستان میں پہلی مرتبہ قائم ہونے والی وزارت مذہبی امور کے وزیر مقرر ہوئے۔

وہ اردو زبان میں ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی کئی کتابوں کا فارسی، انگریزی اور عربی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان کے قلم و زبان سے نکلے ہوئے الفاظ عوام کے لیے روشنی اور امید کا پیغام رکھتے ہیں، مگر استحصالی نظام کے لیے جلتے انگارے۔